زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نومبر، دسمبر ۲۰۲۵ء

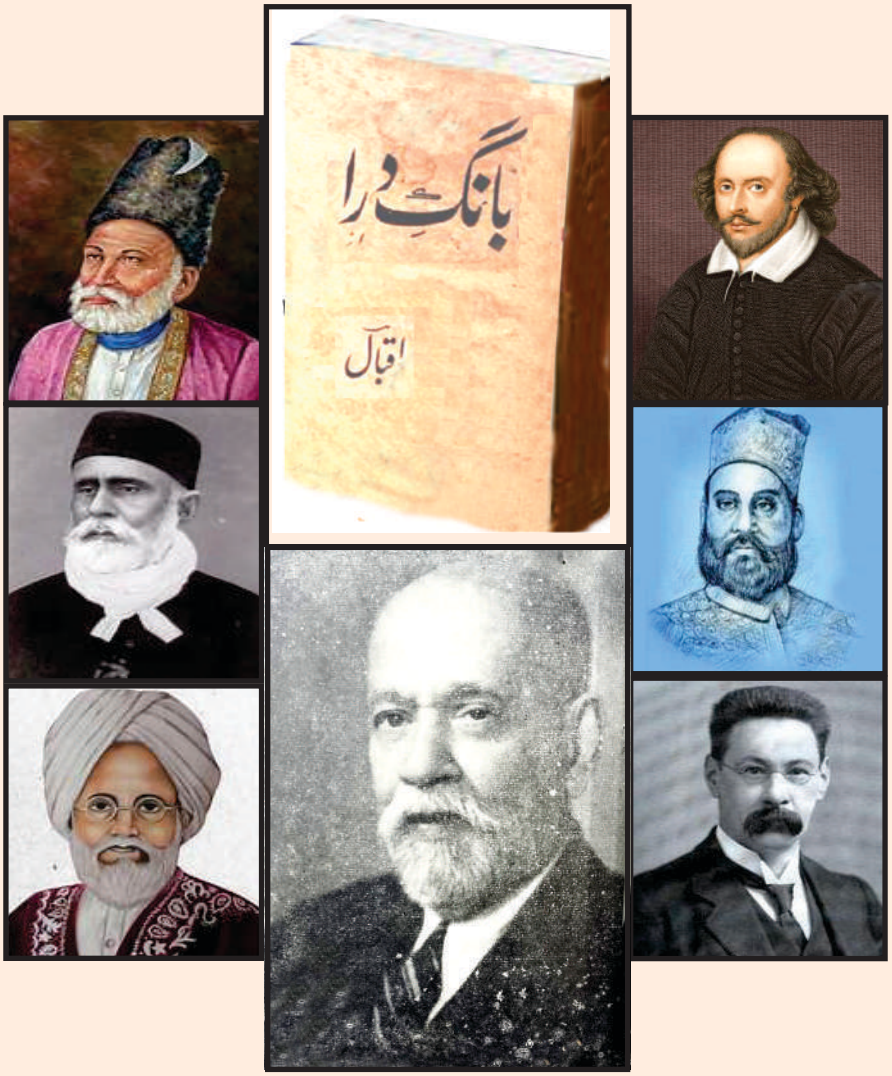

رشید عارفؔ

رشید عارفؔ کا اصل نام عبدالرشید، تاریخ ولادت ۸؍دسمبر ۱۹۴۲ء اور جائے ولادت لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی ہے، لیکن جہانِ سخن میں انہیں قلمی نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ اُن کے والد کا نام عبدالمجید تھا جو بچپن ہی میں انہیں یتیم چھوڑ گئے۔ ۱۹۵۸ء میں میٹرک اور ۱۹۶۸ء میں انہوں نے بی اے کی سند لی اور اسی دوران ۱۹۶۲ء میں انہیں حکومت بہار کے محکمہ مالیات میں چھوٹی سی ملازمت مل گئی اور اسی پر وہ صابر و شاکر رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کا زمانہ بھی انہوں نے اپنے آبائی محلّہ میں گزارا، یہاں تک کہ ۳۰ جون ۲۰۲۰ء کو اپنے مکان واقع احسن کالونی میں اُن کی وفات ہوئی اور مقامی ہاتھی خانہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔ رشید عارف کو خوش قسمتی سے وہ زمانہ ملا تھا جب کہ عظیم آباد میں یادگار شعری نشستوں کی بہار تھی، خصوصاً ''حویلی حاجی خورشید'' میں جہاں اُن کا قیام تھا، طرحی و غیر طرحی مشاعروں کا آئے دن انعقاد ہوا کرتا تھا۔ اس ماحول سے رشید عارف نے نہ صرف گہرا تاثر قبول کیا بلکہ خوب خوب استفادہ بھی کیا، یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء میں وہ عبدالرشید سے رشید عارفؔ بن گئے اور ثاقبؔ عظیم آبادی سے مسلسل مشورۂ سخن کرتے رہے۔ رشید عارفؔ نہ صرف عروس غزل کے شیدائی تھے بلکہ نعتیہ شاعری کا بھی بلند و بالا ذوق رکھتے اور ''انجمن رضائے مصطفیٰ'' کی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور نعتیہ کلام سنانے کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ اُن کا زمانہ ''مگدھ پنچ'' کی پابندی سے اشاعت کا زمانہ تھا، جس کے زیر اثر طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی طرف بھی وہ کامیابی کے ساتھ ملتفت رہے۔

کلام عارفؔ

وقت ہی روز ہمیں زخم نیا دیتا ہے
اور یہی زخم پہ مرہم بھی لگا دیتا ہے

قدر وہ خون کے رشتے کی گھٹا دیتا ہے
بیچ آنگن کے جو دیوار اٹھا دیتا ہے

ایک چنگاری کوئی رکھ گیا دروازے پر
اور پڑوسی مرا شعلوں کو ہوا دیتا ہے

وہ حقیقت کہ جو گزری مرے اوپر عارفؔ
سننے والا اسے افسانہ بنا دیتا ہے

ایک مجھ پر ہی جہاں بھر میں یہ احساں کیوں ہے
مجھ سے مانوس تو اتنا غم دوراں کیوں ہے

لالہ و گل پہ تو کچھ میرا بھی حق ہے ، لیکن
میرے حصے میں فقط خار بیاباں کیوں ہے

ہر ہیوی نس گر پڑیں بستر سے جب
ہنس کر ان سے ان کے شوہر نے کہا

زلزلے سے گر پڑی ہیں آپ ، یا
آپ کے گرنے سے آیا زلزلہ

ہم ٹگ رہے تھے راہ میں فاقوں کی مار سے
اے تھانے دار بابو ، نشہ خوار ہم نہیں

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۶ شمارہ : ۱۱،۱۲
نومبر، دسمبر ۲۰۲۵ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی، عائشہ رفعت

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابرار احمد خان	۳
مقالات	قیوم خضر کا ماہنامہ: اشارہ	حقانی القاسمی	۴
	امیر خسرو کے تنقیدی افکار.....	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۱۰
	شمیم صادقہ: کرچیاں سے صحرے کی پیاس تک	ڈاکٹر آسیہ پروین	۱۵
	اردو کہانی میں انامیت کا رجحان	ڈاکٹر نسیم احمد نسیم	۲۴
	بچوں کا ادب: چند بنیادی اصول	ذکیہ مشہدی	۲۷
	مظفر حنفی: جدید غزل کا امام	انجینئر فیروز مظفر	۳۰
	تقسیم ہند کے متنوع کرب اور چند افسانہ نگار	ڈاکٹر شہلا بانو	۳۳
	لطف الرحمٰن کی غزلیہ شاعری کا انفراد	ڈاکٹر محمد رضوان عالم	۳۸
	بانگ درا کی نظموں میں عالمی شخصیات	محمد فیصل خان	۴۰
یادیں	قیصر عثمانی: کچھ یادیں، کچھ باتیں	نثار احمد صدیقی	۴۷
	ش۔م۔عارف ماہر آروی: کچھ یادیں، کچھ باتیں	سلطان آزاد	۵۱
	قاسم خورشید: کچھ یادیں کچھ باتیں	ڈاکٹر مسرت جہاں	۵۴
افسانے	بازار	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۵۷
	پہاڑ، ندی، عورت	خورشید حیات	۶۰
	حجن گھوڑی والا	رحمان شاہی	۶۴
	موڑ	نوشاد عاطر	۶۸
انشائیہ	ڈگری نامہ	جہانگیر انس	۷۰
منظومات	نعت پاک	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۷۳
	غزلیں ظفر اقبال ظفر	مرغوب اثر فاطمی	۷۵
	غزلیں احمد اورنگ آبادی	طلحہ تابش	۷۷
	غزلیں افسر جمال افسر	ڈاکٹر شاہد فروغی	۷۹
	غزلیں اصغر شمیم / صابر سہرساوی	صدام غنی / حجاب منظر	۸۱
	غزلیں جبیں نازاں / شاذیہ نیازی	مصلح الدین کاظم / حافظ تمنا	۸۳
کتابوں کی دنیا	درد میں تیرتے پھول پرویز مظفر	مبصر: ثناءاللہ ثنا دوگھروی	۸۴
	آبلے پھوٹ پڑے سرور نگینوی	مبصرہ: صبیحہ اطہر	۸۶
	شعلۂ گل ہندی گورکھپوری	مبصرہ: نباہت ملک	۸۸
وفیات	پروفیسر شمیم صادقہ چل بسیں / آہ! قاسم خورشید	ادارہ	۹۲
سلام و پیام	ڈاکٹر نشاط اختر، کائنات ضیا، منیر سیفی، ڈاکٹر شاہد فروغی، شاہد احمد		۹۴

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

شکر واحسان مالک لوح وقلم کا ـــــــ ’’زبان وادب‘‘ کا تازہ شمارہ آپ کی نذر ہو رہا ہے اور اِسی مشترکہ شمارے کے ساتھ بفضل ربی اکادمی مجلّہ کی چھیالیسویں جلد بھی تکمیل پا رہی ہے۔ یہاں مقالاتی آغاز اُس جامع و پر مغز تحریر سے ہوا ہے جس میں ’’قیوم خضر کا ماہنامہ اشارہ‘‘ ضروری اقتباسات اور متعلقہ علمی وفکری جہات کے ساتھ مطالعہ کی کمان وکمند کا اسیر بنایا گیا ہے، بعدازاں ’’دیباچہ غرۃ الکمال‘‘ سے خصوصی استفادہ کرتے ہوئے حضرت ’’امیر خسرؔو کے تنقیدی افکار ونظریات کی عصری معنویت‘‘ دکھائی گئی ہے اور شوکت حیات کا علی الخصوص حوالہ لیتے ہوئے ’’اُردو کہانی میں انامیت کا رجحان‘‘ واضح کیا گیا ہے۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ اس حصہ میں کہیں ’’بچوں کا ادب: چند بنیادی اصول‘‘ کے عنوان سے اطفالیات نویسی کی اخلاقیات ونفسیات پر وسیع تناظر میں روشنی ڈالی گئی ہے، کہیں مظفر حنفی کو علمی آداب کے ساتھ جدید غزل کا امام بتانے کی سعی مشکور ہوئی ہے، کہیں ’’تقسیم ہند کے متنوع کرب اور چند افسانہ نگار‘‘ کا موضوع آئینہ کیا گیا ہے اور کہیں ’’لطف الرحمٰن کی غزلیہ شاعری کا انفراد‘‘ دکھایا گیا ہے تو کہیں ’’بانگ درا کی نظموں میں عالمی شخصیات‘‘ کی سوانح، اُن کے مراتب عالیہ اور اقبالؔ سے اُن کے گونا گوں قلبی وفکری روابط مذکور ہوئے ہیں۔

متذکرہ نگارشات پر مستزاد اسی حصہ میں تعزیتی اور تاثراتی وتجزیاتی انداز لئے ہوئے وہ وقیع مقالہ بھی شامل ہے، جس میں پروفیسر شمیم صادقہ کو اُن کے افسانوی مجموعوں کے حوالے سے ضروری مطالعاتی اقتباسات وحوالہ جات کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے، جب کہ ’’یادیں‘‘ کے تحت ایک طرف قیصر عثمانی اور ش۔م۔عارف ماہرؔ آروی کی خدمتوں اور ان سے ملاقاتوں کے تذکرے ہیں تو دوسری طرف بالمشافہ دید وشنید کے حوالے سے ڈاکٹر قاسم خورشید کے علمی انکسار ان کی خوش طبعی ونفاست پسندی اور ان کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں کے احوال سپرد قرطاس کئے گئے ہیں۔

اس شمارے کے ’’افسانے‘‘ کا آغاز اُس ’’بازار‘‘ سے ہوا ہے جس میں تماشا گاہ کی منظر کشی اور عمدہ فنی بنت کے شانہ بہ شانہ ’’سامری‘‘ کا تہدار استعارہ خصوصیت سے دعوت فکر دیتا ہے اور پھر اسی طرح ’’پہاڑ، ندی، عورت‘‘ میں بھی بلیغ استعارے وعلامات اور ژرف بداماں اشاروں کے ساتھ کہانی کی بافت کا ہنر اور اس کا رنگ وآہنگ روشن ہے، جب کہ ’’حجن گھوڑی والا‘‘ میں پولیس کے کردار اور حفاظتی اہلیت پر جو سوالیہ نشان لگایا گیا ہے، وہ بھی ایک سفاک تجرباتی حقیقت واشگاف کر دیتا ہے اور افسانہ ’’موڑ‘‘ بھی ماضی کی یاد اور جذبات واحساسات کی عکاسی سے عاری نہیں۔

ہمیں پوری اُمید ہے کہ مذکورہ نگارشات کے ساتھ ساتھ ’’انشائیہ‘‘ کے تحت ’’ڈگری نامہ‘‘ میں گل گشت خیال اور طنز وظرافت کا انداز بھی مطبوع خاطر ہوگا، ’’منظومات‘‘ اور ’’کتابوں کی دنیا‘‘ کے اوراق بھی بارونق دکھائی دیں گے اور ’’بچوں کا زبان وادب‘‘ بھی انہیں پسند آئے گا۔

انہیں کلمات کے ساتھ پروفیسر شمیم صادقہ اور ڈاکٹر قاسم خورشید جیسے فن کاروں کے لئے مغفرت کی دعائیں کرتے ہوئے خدا حافظ، خدا ناصر

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

مقالات

حقانی القاسمی

Qaumi Council Barai-e-Farogh Urdu Zaban, New Delhi - 110066 (Mob.9891726444)

قیوم خضر کا ماہنامہ: اشارہ

ماہنامہ ''اشارہ'' کی اشاعت کا آغاز گیا سے ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ اس کے سرنامہ پر ''علم وادب کے نئے اشاروں کا علمبردار'' درج ہوتا تھا۔ قیوم خضر (پیدائش: ۶ دسمبر، ۱۹۲۴۔ وفات: ۱۲/ مارچ، ۱۹۹۸) اس کے مدیر تھے۔ وہ ایک اچھے ادیب اور دانشور تھے۔ ادب وصحافت کے ایک ممتاز خانوادہ سے ان کا تعلق تھا۔ مشہور طنز ومزاح نگار انجم مانپوری ان کے چھوٹے دادا تھے۔ ''اشارہ'' عبدالقیوم انصاری کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ مجلّہ کے معاونین میں عزیز عظیم آبادی، قیوم قادر، حمیدہ بانو راز کے نام شامل تھے۔ ''اشارہ'' کے اشاعتی آغاز کے تعلق سے قیوم خضر لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے جب اگست ۱۹۵۰ء میں پہلی بار اپنے وطن مالوف گیا سے ماہنامہ 'اشارہ' کا اجرا کیا تو میری صحافتی زندگی کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ پچیس برسوں یعنی ۱۹۷۵ تک قائم رہا۔ شروع ہی سے میں نے رسالہ کو عام صحافتی روش سے الگ ایک خاص مزاج میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر صحافیوں کا عام طور پر یہ رویہ چلا آرہا ہے کہ وہ مضامین کی افادیت پر غور نہیں کرتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس مضمون نگار سے زیادہ مالی فائدہ ہونے کی امید ہے۔ اگر غیر افادی مضامین ہونہار نو مشقوں کی ہمت افزائی کے لیے شائع کئے جائیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس میں تعلیم وتربیت کا پہلو مضمر ہے۔ چنانچہ 'اشارہ' میں جہاں ملک کے مستند اور معتبر ادبا اور شعرا کے مضامین نظم ونثر آپ کو ملیں گے، وہیں ان نو مشقوں اور نوجوان ادبا وشعرا کی تخلیقات بھی ملیں گی جن کی نہ کوئی گنتی تھی نہ پوچھ۔ یعنی ادارہ 'اشارہ' نے اپنی پالیسی کے پیش نظر صرف زبانی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ تربیت کی خاطر نئی پود کے ادبی نونہالوں کی کچی پکی چیزوں کو چھاپ کر عملی طور پر ایسی حوصلہ افزائی کی کہ ان میں سے بیشتر ادبا اور شعرا ایسے ابھر کر سامنے آئے جو آگے چل کر آسمان ادب کے آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے۔'' (صحرائے صحافت کی آوارہ گردی، محاسبہ، ص ۱۲۱)

اور یہ سچ ہے کہ قیوم خضر نے صحافت میں اوروں سے الگ اور عمدہ تجربے کیے۔ انہوں نے مجلّہ کو صرف ادبی موضوعات اور مسائل پر مرکوز نہیں رکھا بلکہ سماج اور سیاست کے مختلف رنگوں سے بھی قاری کو روشناس کراتے رہے۔ انہوں نے اپنے ایک اداریے میں ''اشارہ'' کے امتیازات کو واضح کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

> ''اشارہ نے کچھ کارہائے نمایاں بھی انجام دیے ہیں۔ ہم نے نئے ادیب وشاعر کو روشناس کرانے کے علاوہ ان ادبا وشعرا کے قلم کو بھی متحرک کیا جو برسہا برس سے منجمد تھے اور بلا شبہ 'اشارہ' نے یہ بڑا کام انجام دیا۔ ہم نے ایک نیا چراغ بھی جلایا۔ یعنی اردو ادب میں سب سے پہلے 'اشارہ' نے حاشیائی ادب کی بات پیش کی اور اس طرح پیش کی کہ اہل الرائے حضرت کے درمیان ادب کا ایک نیا مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ اس پر مضامین لکھے گئے اور دوسروں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔''

یقینی طور پر یہ ''اشارہ'' کا امتیاز ہے کہ حاشیائی ادب کو ایک مستقبل موضوع بنا کر مجلّہ میں اسے مرکزیت عطا کی گئی، ورنہ عام طور پر ادبی رسائل مرکز مرکوز ہی ہوتے ہیں اور حاشیائی آبادیاں اکثر و بیشتر نظر انداز کردی جاتی ہیں۔

قیوم خضر کا انداز نظر جداگانہ تھا۔ ان کی سوچ عام روش سے

ذرا مختلف تھی۔ ادب، ثقافت، سیاست، معاشرت کے تمام پہلوؤں پر ان کی گہری نگاہ تھی اس لئے ان کے اداریوں میں عام طور پر سیاسی اور سماجی شذرات اور اشارات بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کا مقصد صرف تخلیقی یا ثقافتی سطح پر لوگوں کو بیدار کرنا نہیں تھا، بلکہ عوام میں سماجی اور سیاسی شعور بھی پیدا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر اداریوں میں سیاست، معاشرت کے رجحانات اور رویے پر گفتگو ہوا کرتی تھی اور وہ کھل کر اپنے سیاسی رجحانات کا اظہار بھی کرتے تھے۔ خاص طور پر فسطائیت، فرقہ واریت اور فسادات کے تعلق سے انہوں نے بہت اہم اداریے تحریر کئے اور عوام کو اتحاد، یکجہتی اور یگانگت کی تلقین کی۔ انہوں نے خود ہی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''میں نے قومی یکتا کے موضوع پر جتنے اداریے لکھے اور دوسروں کے جتنے مضامین چھاپے، اس دور میں شاید ہندوستان کا کوئی اردو ماہنامہ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔'' (ارتعاش قلم ص، ۲۶)

اپنے ایک اداریے میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ:

''کوئی مذہب بھی انسانوں میں منافقت کا جذبہ پھیلانے نہیں آیا۔ مذاہب کے علاوہ دوسری تمام سوشل تحریکیں بھی زندگی کو سدھارنے کے لئے وجود میں آئیں۔ شاعری، مصوری، موسیقی ان تمام چیزوں کا مقصد یہی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی آدمی رہے۔ خونخوار وحشی درندہ نہ ہوجائے۔''

قیوم خضر نے ''اشارہ'' کا ''قومی یکجہتی نمبر'' بھی اسی مقصد کے تحت شائع کیا تھا جس میں کئی قیمتی مضامین شامل کئے گئے۔ جن میں ''جواہر پارے'' (جواہر لال نہرو) ''قومی اتحاد کی بنیاد، رواداری اور بردباری'' (سردار پرتاپ سنگھ کیروں) ''قومی یکجہتی'' (ڈاکٹر نرمدیشور پرتاپ) ''ہندوستان قومی یکجہتی کے آئینے میں'' (ماہ منیر خان) ''ہندوستان کا جذباتی اتحاد'' (چندر بھان گپتا، وزیر اعلیٰ اتر پردیش) ''ہندوستان میں قومی اتحاد کا مسئلہ'' (ضیا الدین احمد) اور اختر قادری کے ایک ڈرامہ ''یاران وطن'' کے نام قابل ذکر ہیں۔

سماج اور سیاست کے جمود کو توڑنے کے علاوہ انہوں نے ادبی جمود کو بھی توڑنے کی کوشش کی کہ دراصل جس دور میں ''اشارہ'' نکل رہا تھا وہ دور بھی ادبی اور ثقافتی لحاظ سے کم پر آشوب نہیں تھا۔ زوال کی پرچھائیں صاف صاف نظر آرہی تھی، اسی لئے اپنے ایک اداریے میں انہوں نے یہ لکھا:

''ادھر پانچ برسوں سے اردو ادب میں ایک طرح کا انجماد سا محسوس ہوتا ہے، جو پرانے ادیب وشاعر ہیں وہ تھکے تھکے سے معلوم پڑتے ہیں اور نئے ادیب وشاعر نظر نہیں آتے اور اگر آتے بھی ہیں تو خال خال۔ ادب میں کوئی جان نہیں، کوئی نئی بات نہیں، کوئی نئی بحث نہیں، لے دے کے صرف غزلوں کی بھرمار ہے، جسے دیکھئے بیٹھا ہوا صرف غزل لکھ رہا ہے اور اونگھ رہا ہے۔ کسی کی غزل میں زندگی کی لو نہیں، زندگی کی کوئی چمک نہیں، ان میں صرف فرسودہ خیالات اور قافیہ وردیف کی پابندی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔''

نومبر ۱۹۶۰ء میں قیوم خضر نے جو بات لکھی تھی آج بھی وہ بات حرف بہ حرف صحیح ہے اور عہد حاضر پر بھی صادق آتی ہے کہ ابھی بھی ادب و ثقافت کا معاملہ پہلے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ''اشارہ'' میں شامل

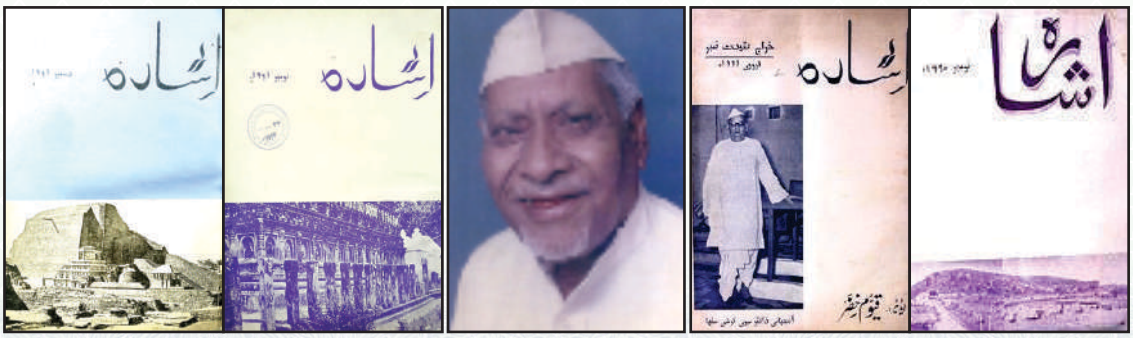

اختر اورینوی کا مضمون شاعری میں روایت وجدت کا یہ اقتباس بھی اس بات کی تصدیق وتوثیق کرتا ہے:

''اقبالؔ کے بعد اردو شاعروں کا قد گھٹتا جا رہا ہے اور اب تو بونوں کی کثرت پائی جاتی ہے۔''

قیوم خضر کو غزل کی کثرت سے وحشت ہوتی تھی۔ انہیں شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ نثری ادب کی طرف قلم کاروں کی زیادہ توجہ نہیں ہے۔ وہ صرف اور صرف غزل گوئی میں مصروف ہیں، اسی لئے انہوں نے ستمبر ۱۹۶۱ء کے اداریے میں لکھا تھا کہ:

''افسوس ادھر دس بارہ برسوں سے معیاری نثری چیزوں کا قحط ہے اور تمام لوگ صرف غزل گوئی کی طرف مائل ہیں۔ یہ یقینی اردو کے لئے نحس کی بات ہے۔''

قیوم خضر نے اردو زبان کے مسائل اور متعلقات کے حوالہ سے بھی بہت اہم اداریے تحریر کئے۔ اردو سے جڑے ہوئے لوگوں کو انہوں نے بیدار کرنے کا بھی کام کیا اور اردو کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کا ازالہ کرنے کی بھی کوشش کی۔

اردو کے تعلق سے ان کے ذہن میں بہت سے منصوبے اور خاکے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اردو زبان کو وہ حق ملے جس کی وہ مستحق ہے، اسی لئے وہ اردو کے لئے کی جانے والی تمام کوششوں کا خیر مقدم کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو بنیادی طور پر قیوم خضر اردو زبان کے ایک بہترین وکیل تھے، جنہوں نے ہر موڑ اور ہر مرحلے پر اردو کی وکالت کی اور اردو زبان کی لسانی اور فکری خصوصیات سے قارئین کو آگاہ کیا۔

اس حوالہ سے اُن کی ایک بہت اہم کتاب ''اردو اور قومی ایکتا'' بھی ہے، جو پانچ ابواب پر محیط ہے، جس میں اردو کے تعلق سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا مدلل انداز میں دفاع کیا گیا ہے اور خاص طور پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اردو نہ غیر ملکی زبان ہے اور نہ ملک دشمن زبان ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ قومی ایکتا کی زبان ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو، ہندی تنازعہ پر بھی مدلل گفتگو کی ہے، اردو کی محبت اور دفاع میں ''اردو درپن'' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی جس میں انہوں نے اردو زبان کا بین تفاعلی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اردو قومی یکجہتی کی سنگ بنیاد ہے۔

قیوم خضر مسلسل اردو کے حوالے سے لکھتے رہے اور یہ ہندوستانی عوام کو بتاتے رہے کہ اردو کے تعلق سے تعصب اور تنگ نظری بے بنیاد ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا تھا کہ:

''اردو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک کی رنگ برنگ زبان، رنگ برنگ تہذیب اور رنگ برنگ علاقائی علامتوں کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ اس لسانی گلدستے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر رنگ کے پھول ایک ساتھ اپنی اپنی پھبن اور بانکپن کے ساتھ مسکراتے ہوئے ملیں گے۔ ان لسانی پھولوں میں دراوڑی، آریائی، پالی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، لاطینی، فرانسیسی، پرتگالی، چینی، یونانی، انگریزی، ہریانی، بھوجپوری، مگہی، پوربی اور دکنی گویا مختلف زبانوں کا رنگ بھی ملے گا اور خوشبو بھی ملے گی۔ اردو حب الوطنی اور بھائی چارگی کی مکمل تاریخ اور بھرپور علامت ہے۔''

وہ یہ مانتے تھے کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور یہ نہایت کشادہ ذہن اور فراخ دل زبان ہے۔ انہوں نے اپنے ایک اداریے میں اردو

زبان کی اس انفرادی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''اردو ایک ایسی زبان ہے جسے وقت نے اپنی کوکھ سے جنم دیا اور حالات نے جھولا جھلا کر پروان چڑھایا۔ اس کی رگوں میں خالص ہندوستانی خون دوڑتا نظر آتا ہے۔ اس کا مزاج حب الوطنی اور دیش بھکتی کے جذبوں سے سرشار ہے۔ اردو ہندوستانیوں کے دل کی دھڑکن اور ان کے لبوں کی معصوم مسکراہٹ ہے۔ یہ زبان ہندو مسلم ایکتا کی جان اور قومی یکجہتی کی روح ہے۔ اس زبان میں بڑی فراخ دلی ہے۔ اسے تنگ نظری اور تعصب سے شدید نفرت ہے۔''

ایک اور اداریے میں انہوں نے مظفر پور اردو کانفرنس کے حوالے سے اردو پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

''اردو خالص لسانی مسئلہ ہے۔ یہ ہندو مسلم میل کی واحد نشانی ہے۔ نیشنلزم اور اردو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اردو کی مٹی ہندوستانی کلچر اور ہندو مسلم اتحاد کے خمیر سے گوندھی گئی ہے۔''

''اشارہ'' میں زندہ اور زندگی سے جڑے ہوئے موضوعات پر ہی اداریے ہوتے تھے، اسی لئے قیوم خضر کے اداریے عوام وخواص دونوں میں مقبول تھے اور ان اداریوں کی حیثیت ایک مشعل راہ کی سی تھی۔

قیوم خضر نے اپنے مجلّہ میں موضوعاتی تنوع کا خاص خیال رکھا اور ایسی تحریروں کو ترجیحی طور پر شائع کیا جن سے معاشرے کو روشنی ملے۔ ''اشارہ'' کے مختلف شماروں میں جو مضامین ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے افادی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ''بہار میں اردو'' (حسن مثنیٰ ندوی) ''مومنؔ اور وہابی تحریک'' (نادمؔ بلخی) ''کیا اکبر رجعت پسند تھا؟'' (سہیل الرحمٰن انجمؔ) ''ہندی کے مسلم شعرا'' (قیصر سرمست) ''ادبی تخلیق وتنقید'' (صابرؔ شاہ آبادی) ''کلیم الدین احمد کی بیالیس نظمیں'' (محمد مظفر حسین ایڈوکیٹ) ''نظیرؔ کو کس نے زندہ کیا'' (پروفیسر سید یوسف الدین احمد بلخی) ''اردو شاعری کے مختلف اصناف'' (جوش ملسیانی) ''اردو شاعری میں نام و پیام'' (ہربنس لال نارنگ) ''خزانہ علم وفن کتب خانہ مشرقیہ'' (ماہ منیر خان) ''رسالہ مطلوب المبارک'' (پروفیسر خورشید حیدر) ''فانیؔ کا غم'' (ہربنس لال ایم اے) ''اردو ادب میں کرشن بھکتی کی روایت'' (پروفیسر سید حسن) ''اکبرؔ اور مسئلہ زبان'' (ابوذر عثمانی) ''شکیلہ اختر بحیثیت افسانہ نگار'' (شعیب راہی) ''پنجابی میں امریکی لوک گیت'' (ہربنس سنگھ) ''اختر اورینوی بحیثیت نقاد'' (قمر اعظم ہاشمی) ''احمد عظیم آبادی'' (طلحہ رضوی برق) ''گیا کی تاریخی اہمیت'' (موہن لال مہتو بیوگی) ''آنجہانی کشتہؔ گیاوی'' (نریندر نارائن لال) ''مولانا ابوالکلام آزاد اور الپنسچ'' (سید بدرالدین احمد بدرؔ عظیم آبادی) ''امیر مینائی عظیم آباد میں'' (فصیح الدین بلخی) ''اردو شاعری کے نئے عناصر'' (علیم اللہ حالیؔ) ''فلسفہ زبان واقوام'' (اختر اورینوی) ''کشمیر میں اردو صحافت'' (واقف کار) ''بہار کا پہلا اردو ڈرامہ'' (ایس حسن) ''بہار کا گمنام مصنف مولوی حسن علی'' (ایس حسن) ''میرؔ کی المیہ شاعری'' (سعیدہ وارثی، ایم اے) وغیرہ اہم ہیں۔ یہ تمام مضامین آج کے عہد میں بھی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین کی مکرر اشاعت سے یقینی طور پر علمی اور ادبی معاشرے کو بہت فائدہ ہوگا۔ خاص طور پر پروفیسر سید حسن کے مضمون ''اردو ادب میں کرشن بھکتی کی روایت'' کی اشاعت ہونی چاہئے کہ اس میں انہوں نے دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ادب کا بیشتر حصہ دیسی ہے اور اس زبان میں ہندوستانی کلچر کے عناصر ہیں اور یہ زبان ملی جلی سنسکرتی کی نمائندہ ہے۔ انہوں نے اس میں کرشن کنہیا کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''مسلمان انہیں پیغمبر مانتے ہیں اور خواجہ حسن نظامی تو انہیں خدا کا اوتار کہتے تھے، جب کہ اس کے برعکس لالہ لاجپت نے انہیں خدا کا اوتار ماننے سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض ہندو مصنفین نے انہیں ہوسناک نوجوان اور عیاش بھی بتایا ہے، مگر خواجہ حسن نظامی نے ان کی پاکبازی اور پرہیزگاری کو بیان کیا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کرشن جی کو ہادی مانتے تھے۔''

''اشارہ'' ہی میں ایک بہت ہی وقیع مقالہ ''ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی کردار تاریخ کی روشنی میں'' شائع ہوا تھا۔ چالیس صفحات پر محیط

اس مقالہ میں مسلمانوں کے قومی کردار اور تشخص پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ:

''اگر ہندوستان کی ساری تاریخی کتابیں ختم کردی جائیں نیز تمام تحریکات کے تذکرے گم کر دیے جائیں اور صرف اردو لٹریچر باقی رہ جائے تو آپ ہندوستان کی عہد بہ عہد کی مسلسل تاریخی کڑیوں کو جوڑ سکتے ہیں اور آپ کو صرف اردو کے ذریعے ہندوستان کی مکمل تاریخ کی آگاہی ہوسکتی ہے۔''

ایک اور اہم مضمون ''نظیر کو کس نے زندہ کیا'' کے عنوان سے پروفیسر سید یوسف الدین احمد بلخی کا ہے، جنہوں نے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ:

''حق تو یہ ہے کہ نظیر آج بھی بے نشان ہوتا اگر سرمہر اضلع پٹنہ کے رہنے والے مولانا سید عبدالغفور شہباز 'زندگانی بے نظیر' اور 'کلیات نظیر اکبرآبادی' لکھ کر اسے روشناس نہ کراتے۔''

''اشارہ'' کے کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے جن میں جمیعۃ العلمائے ھند کے بائیسویں اجلاس پر ایک شمارہ شائع کیا گیا۔ ''اشارے'' کے تحت ''بہار میں بہار آئی'' عنوان کے تحت قیوم خضر نے لکھا تھا:

''ہمارا دیس وہی مقدس اور تاریخی دیس ہے جہاں آریہ بھٹ نے دنیا والوں کو نجوم وفلکیات کی دولت عطا کی، جہاں اشوک اعظم نے ۲۷۳ قبل مسیح پاٹلی پترا میں ایسی بے مثال حکومت قائم کی تھی جس کی پیروی آج بھی ہم کرنا چاہتے ہیں، جس کا چکر ہمارے قومی نشان کی زینت ہے اور جس کے شاہی لاٹ کے سرے کو ہم نے مہر شاہی کے لئے منتخب کیا ہے۔ اسی زمین کی گود سے راجہ جنک پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ اور مہاویر جیسے بانیان مذاہب پیدا ہوئے۔ سیتا جی جیسی لافانی دیوی نے جنم لیا۔ یہیں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر حکیم بید پانے سنسکرت زبان میں ادب کے وہ پھول کھلائے جس کا ترجمہ 'کلیلہ دمنہ' دنیا بھر میں موجود ہے۔ دھنوتری اسی دھرتی کا بیٹا تھا جس نے علم ویدک ایجاد کر کے دنیا والوں کو ایک طریقہ علاج کی راہ پیش کی۔ سنسکرت زبان کے قواعد وصرف کو اسی بہار میں پائننی اور پتانجلی نے ترتیب دیا۔ اصول سیاست کے بانی چندر گپت کا وزیر پوٹلیا یہیں کا باشندہ تھا۔ منطق ہند کے موجد گوتم رشی کو یہیں کے ذروں نے آفتاب بنایا۔''

ایک مضمون پروفیسر عبدالخالق کا ''اختر اور اختر ایک تاثر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے بہار کے گوتمی اور مہابیری مزاج اور کردار کے حوالہ سے بڑی اچھی گفتگو کی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ:

''بہار یا تو مردم خیز خطہ رہا ہے یا مذہب بیزار۔ اس نے ہر عہد میں جو ہر قابل پیدا کئے ہیں۔ یہ اور بات کہ ان میں سے کچھ نے ہی شہرت پائی ہے۔ زیادہ تر نے تو گمنامی اور کمنامی کے سائے میں زندگی گزار دی ہے۔ ویسے جنہیں طرۂ امتیاز بننا تھا وہ گرد راہ ہی بنے رہے، محض اپنی قناعت پسندی کے صدقہ۔ دراصل یہاں کی فطرت میں گوتمی خاکساری اور مہابیری انکساری کچھ ایسی رچ بس گئی ہے کہ لوگ قناعت پر تکیہ کناں اور شہرت سے گریزاں زندگی گزارنے کے عادی سے ہوگئے ہیں اور یوں بھی آج کتنے قطرے ہیں جو طوفان نہ بنے اور کتنی چنگاری ہے جو شعلہ جوالہ نہ بنی۔'' (اشارہ، جون ۱۹۶۶)

''اشارہ'' کے خصوصی شماروں میں ''عید نمبر'' اور ''خراج عقیدت نمبر'' بھی قابل ذکر ہیں۔ آنجہانی ڈاکٹر سری کرشن سنہا وزیر اعلیٰ صوبہ بہار پر ایک شمارہ نکالا گیا تھا، جس میں قیوم خضر، ماہ منیر خان، موہن لال مہتو بیوگی، اوما ناتھ ایم اے، اکشے کمار سنہا کی تحریریں تھیں۔ یہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۱ء تک بہار کے وزیر اعلیٰ رہنے والے کرشن سنہا کو بہت ہی عمدہ خراج عقیدت تھا۔ ان کا تعلق ضلع مونگیر سے تھا۔

اشارہ کی ترتیب اور فہرست کے عنوانات پرکشش اور جاذب نظر ہوتے تھے۔ مقالات ومضامین ''تگ ودو'' کے تحت شائع کئے جاتے تھے۔ نظموں اور غزلوں کی اشاعت ''رزم وبزم'' کے عنوان سے ہوتی تھی۔ افسانے ''دھوپ چھاؤں'' کے تحت شائع کئے جاتے تھے اور

تبصرے کا عنوان تھا ''کھرے کھوٹے''۔ فہرست کے عنوانات کبھی کبھی تبدیل بھی کئے جاتے تھے۔ ''عرق ریزی'' کے تحت مقالات ومضامین شائع کئے گئے تو نظموں اور غزلوں کو ''عطر بیزی'' کا عنوان دیا گیا۔ افسانے اور خاکہ ''عکس ریزی'' کے تحت شائع کئے گئے اور تبصرہ و تنقید کے لئے ''دیدہ ریزی'' منتخب کیا گیا۔ غرض کہ قیوم خضر نے ہر سطح پر کچھ اچھے تجربوں کی کوشش کی اور ان کے تجربے کامیاب بھی رہے۔

ماہنامہ ''اشارہ'' تین ادوار پر محیط ہے۔ پہلے دور کا تعلق اگست ۱۹۵۰ء تک کا ہے۔ پانچ شماروں کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ دوسرے دور کا آغاز ''اسماعیل منزل'' محلّہ گزری، پٹنہ سیٹی سے ہوا۔ دسمبر ۱۹۵۳ء سے اپریل ۱۹۵۴ء تک یہ سلسلہ رہا۔ تیسرا دور محلّہ صادق پور سرائے پٹنہ سیٹی سے شروع ہوا۔ نومبر ۱۹۵۸ء تک وہاں سے رسالہ شائع ہوتا رہا اور پھر اگست ۱۹۶۷ء میں اس کی اشاعت ملتوی ہو گئی اور ''اشارہ'' ہفتہ وار ہو گیا۔ تقریباً ماہنامہ ''اشارہ'' کے سو شمارے شائع ہوئے اور ۲۳/اپریل ۱۹۷۵ء کو قیوم خضر نے صحافت کو الوداعی سلام کہا۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

> ''۲۳/اپریل ۱۹۷۵ء کو ہمیشہ کے لئے صحافت کے میدان سے کنارہ کش ہو گیا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ادب وصحافت کا روگ ایسا ہے کہ کینسر کی مہلک بیماری اچھی ہو سکتی ہے، مگر اس روگ سے نجات پانا ممکن نہیں۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ ادبی روگ نے صحافت کے بجائے تصنیف وتالیف کا رخ اختیار کر لیا اور جب علم و ادب کی سرگرمیاں اس نئی راہ پر گامزن ہوئیں تو صحافت کی سعی نامشکور سے نجات مل گئی۔'' (محاسبہ، ص ۱۳۷)

ماہنامہ ''اشارہ'' ادبی صحافت میں بہت قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اس کے اندر علوم وادبیات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ماہنامہ ''اشارہ'' کا ایک جامع انتخاب شائع کیا جائے۔ ❁❁

اردو زبان وادب چند قابل فکر نکات

''اردو زبان دنیا کی بہت ساری زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر سہی، لیکن اس لحاظ سے یقیناً بڑی ہی خوش قسمت اور دل پزیر زبان ہے کہ اس کی لطافت وشیرینیت کا ہر زمانے میں اور ہر زبان سے برملا اعتراف ہوتا رہا ہے۔ یہ کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ سبھوں کی زبان ہے۔ اردو صوتیات کے حسن کی ساری دنیا معترف ہے اور سچ پوچھئے تو اردو کی شیرینیت کا راز اسی میں ہے، مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ہم اردو کی مٹھاس کا ذکر تو کرتے ہیں اور اس ذکر کو سن کر خوب خوش بھی ہوتے ہیں، لیکن ہماری توجہ اِس طرف نہیں جاتی کہ ہم اُسے اپنے عمل کی دنیا میں اُتارنے پر دھیان دیں اور اپنے بچوں کو شروع سے ہی شین، قاف کی درستگی پر توجہ دلاتے رہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اور عدم توجہی کی کچھ ایسی ہی صورت حال اردو لکھائی کے سلسلے میں بھی ہے، ہم اردو تحریر کے حسین، پرکشش اور جاذب نظر ہونے کی دہائی دیتے ہیں اور اردو املا کے بارے میں جدید تبدیلیوں کی بابت بڑی بڑی سفارشیں کرتے رہتے ہیں، لیکن اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے اور اصلاح کار کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے بچے کس قدر اغلاط کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اردو کتب ورسائل میں نوع بنوع غلطیوں کا عالم کیا ہے؟ تلفظ درست ہو تو یقیناً درستگی سے لکھنے میں بھی خاصی بنیادی مدد ملتی ہے۔ کلام میں تاثیر اور شیرینیت کے لئے اردو کا سہارا لینا ضروری ہے، مگر ہمیں غیروں سے شکوہ کیا جب ہم خود ہی اس کی اہمیت سے غافل ہیں۔ یہ غفلت کتنی ہی گہری اور لمبی سہی، لیکن سچے عزائم، دیکھتے دیکھتے غفلتوں کے غبار دھوڈالتے ہیں۔ بس بات اتنی ہے کہ کیا ہم اپنے اندر یہ عزم راسخ پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ جواب نفی میں نہیں ہو سکتا۔'' (اداریہ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۱۱ء، بقلم ڈاکٹر منصور احمد اعجازی)

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ
Deptt. of Arabic & Persian, University of Allahabad, Prayagraj - 211002
(Mob.7500984444)

امیر خسرو کے تنقیدی افکار ونظریات کی عصری معنویت

حضرت امیر خسرو دہلوی ہمارے ملک ہندوستان کی ایک ایسی رفیع الشان اور نابغہ روزگار شخصیت کا نام ہے جو صدیوں کے انتظار کے بعد بھی شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس عظیم شخصیت کے علمی کارناموں کی رنگارنگی، ادبی شہ پاروں کی بوقلمونی اور شخصیت کی گوناگوں خصوصیات کے سبب ہمیشہ کوئی نہ کوئی نکتہ روشن ہوکر ہم جیسے طالب علموں کو غور وفکر کی نئی نئی جہتیں عطا کرتا رہتا ہے۔

امیر خسرو یقیناً ایک عمدہ قصیدہ گو، بزرگ ترین مرثیہ نویس، عظیم مثنوی گو، بے نظیر موسیقی داں، یگانہ عصر تاریخ داں، سبک ہندی کے بنیان گزار اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادبی ناقد بھی تھے اور اگر ان کو فارسی ادبی تنقید کا بنیان گزار کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا، حالاں کہ اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ اس یگانہ عصر شخصیت کے لاتعداد منظوم ومنثور کارناموں کے مقابلے میں اس کی انتقادی خدمات کی طرف بہت زیادہ توجہ صرف نہیں کی جاسکی ہے، حالاں کہ یہ ایک ادبی تاریخی حقیقت ہے کہ اپنے متنوع کارناموں کے ساتھ ساتھ امیر خسرو نے فارسی ادبی نقد نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں جن کے لیے فارسی ادب ہمیشہ ان کا احسان مند رہے گا۔

بلاشبہ تنقیدات خسرو کی ارزش وافادیت آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح باقی ہے جیسا کہ ان کے اپنے زمانے میں تھی اور دراصل یہی ایک عظیم فنکار کی سب سے اہم پہچان ہوتی ے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے علمی کارناموں کی آب وتاب کم نہیں ہوتی بلکہ مزید درخشاں وتابندہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

امیر خسرو کو فارسی زبان وادبیات کی طول طویل تاریخ میں پہلے ادبی ناقد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ درست ہے کہ امیر خسرو نے ادبی نقد کے موضوع پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن ان کے تنقیدی رجحانات کو ان کے منثور ومنظوم آثار میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے خصوصاً ان کے شعری مجموعوں کے منثور دیباچوں میں ان کے تنقیدی نظریات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے شعروشاعری کے محاسن ومعائب سے متعلق شعوری طور پر ایک ادبی صنف کی حیثیت سے گفتگو کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، مگر شعر کے حسن وقبح کے متعلق اپنے خاطرات کو بحسن تمام سپرد قلم وقرطاس کر دیا ہے اور اپنی کتابوں میں ادبی نقد کے متعلق جو جستہ جستہ اشارے کیے ہیں وہ بھی کم غور وفکر کے متقاضی نہیں ہیں، خاص طور پر انہوں نے اپنے دیوان ''غرۃ الکمال'' کے منثور دیباچے میں فارسی شعروادب کے محاسن ومعائب کے متعلق جن خیالات یا شعری نکات کا اظہار کیا ہے وہ ادبی نقد کے اعتبار سے خاصی اہمیت وافادیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے جدید ادبی ناقدین کے لیے لائق تقلید بھی ہیں، کیوں کہ انہوں نے شعروشاعری کے جو میزان ومعائر مرتب کئے ہیں وہ آج بھی جدید ناقدین ادب کے یہاں مورد بحث نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے ان کی ناقدانہ بصیرت کی توصیف وستائش کرتے ہوئے ''دیباچہ غرۃ الکمال'' کے بارے میں بالکل درست لکھا ہے کہ خسرو نے اپنے دیباچے اور مضامین میں انتقادی خیالات پیش کئے ہیں، مثلاً یہ بتایا ہے کہ:

> ''فن شاعری کی خوبیاں کیا ہیں، فارسی شاعری کو کس بنا پر عربی پر ترجیح دی جاسکتی ہے، شعر کی اقسام کیا کیا ہیں، ہندوستان کی فارسی شاعری کو کیوں امتیاز حاصل ہے، شاعری میں مہارت کن طریقوں سے پیدا کی جاسکتی ہے.....'' (امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا، دہلی ۲۰۰۷ء)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، عصر حاضر میں جب کہ فارسی زبان کی ادبی تنقید

اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے اور صدہا بلکہ ہزار ہا ناقدین ادب اس فن کو بام عروج پر لے جانے میں مسلسل کوشاں نظر آتے ہیں، امیر خسرو کے تنقیدی رجحانات کی افادیت واہمیت اور عظمت ووقعت میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ''غرۃ الکمال'' امیر خسرو کے فارسی کلام کا تیسرا سب سے زیادہ مشہور ومعروف شعری مجموعہ ہے اس دیوان میں انہوں نے اپنی عمر کے ۳۴ سال سے لے کر ۴۳ سال تک کے کلام کی جمع آوری کی ہے، یہ دیوان ان کی شاعری میں عظیم شاہکار ہے اور اس دیوان کا منثور دیباچہ ان کے شاعرانہ کمالات پر توفق وترجیح رکھتا ہے۔ اس دیباچہ میں امیر خسرو نے نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی وسماجی حالات، تہذیب و تمدن اور شعر وشاعری کی اصناف کے متعلق اظہار خیال کیا ہے بلکہ نقد ادب کے موضوع پر بھی بڑی سیر حاصل اور پر مغز گفتگو کی ہے۔ اس میں فارسی وعربی شعر وادب کے محاسن ومعائب کے متعلق جن خیالات یا نکات پر گفتگو کی گئی ہے وہ ادبی نقد کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ خصوصی غور وفکر کے متقاضی ہیں بلکہ جدید ادبی ناقدین کے لیے بھی مورد تفکر اور لائق تامل قرار دیئے جاتے رہے ہیں اور اس اعتبار سے تو ان کے تنقیدی نظریات کی اہمیت وعظمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں یہ اصول وضوابط اہل علم کے سامنے پیش کیے تھے، جب ادبی تنقید کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا، حتیٰ کہ لوگ ادبی نقد کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ ایسے وقت اور حالات میں فن نقد سے متعلق ایک مبسوط اور واضح نقطہ نظر پیش کرنے کی جسارت صرف امیر خسرو جیسا باکمال دانشور ہی کر سکتا تھا۔

خسرو نے جس بے باکی و بے تکلفی اور مدلل ومفصل انداز میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا ہے وہ بھلے ہی ان کے اپنے زمانے میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل قرار نہ دیئے جا سکے ہوں، لیکن عصر حاضر میں ان کی افادیت واہمیت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے، انہوں نے اپنے اس دیباچے کو تنقیدی ادب کی ایک مکمل تصنیف کے طور پر اہل علم کے سامنے پیش کیا ہے، تاکہ نہ صرف معاصرین بلکہ آنے والی نسلیں بھی ان سے تادیر مستفیض ہوتی رہیں پروفیسر لطیف اللہ نے اس دیوان کے دیباچے کی انتقادی اہمیت وارزش کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس دیباچے میں نقد ادب کے باب میں جو اصول وضع کئے گئے ہیں، ان کی اہمیت وافادیت سے انکار ناممکن ہے، بلکہ بلاخوف وتردید کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی جامعات میں اگر یہ دیباچہ داخل نصاب کیا جائے تو اس خلا کو پر کرنے میں مدد ثابت ہو سکتا ہے جو بوطیقات کے بعد شعرا کے تذکروں تک نظر آتا ہے۔'' (دیباچہ غرۃ الکمال مترجم پروفیسر لطیف اللہ، مطبع نامی فضلی سنز، کراچی ۲۰۰۴ء، ص ۲۱)

امیر خسرو نے اس زمانے کی رسم کے مطابق اپنے اس منثور دیباچے کی شروعات حمد باری تعالیٰ سے کی ہے اور پھر نعت رسول اور منقبت ومدح شیخ کے بعد انسان کی قوت گویائی سے متعلق بڑی فکر کن اور پر مغز گفتگو کے ساتھ انسانی گویائی کو دنیا کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک شمار کیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے شعر شاعری سے متعلق اپنے ذی قیمت افکار ونظریات کو پیش کیا ہے۔

امیر خسرو کے نزدیک نثر کے مقابلے نظم زیادہ معتبر اور اہم ہے یعنی وہ منثور آثار کے بجائے منظوم آثار کی برتری اور عظمت کے قائل ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ نظم ایک ایسا سونا ہے جس کو حکمت کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، اس لیے شعر کا رتبہ ہمیشہ نثر سے بلند اور اعلیٰ رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شعر وشاعری ایک ایسا سمندر ہے، جس کے کنارے پر بیٹھ کر بھی معانی ومفاہیم کے درنایاب حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو اپنے اس دیباچے میں شاعری کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر شعر کے ارکان میں ایک لفظ کی بھی کمی وبیشی ہو جائے تو وزن ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کانوں کو گراں

محسوس ہونے لگتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین شعر نے شعر کی باریکیوں کو کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان میں بال برابر فرق کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے اور اگر کوئی شعر کے مقررہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ شاعر نہیں ہوسکتا، جب کہ نثر کے ساتھ ایسا نہیں ہے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعری نظم سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔

امیر خسرؔو شعر کی دولت کو دنیا کی تمام نعمتوں اور دولتوں میں سب سے افضل اور اعلیٰ قرار دیتے ہیں جس کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ دنیاوی جاہ وحشم اور مال و دولت کا خاتمہ ہوسکتا ہے، لیکن شعر کی دولت ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتی ہے اور یہ وہ ہنر ہے جس کے سامنے بڑے بڑے ہنرمند بھی اپنا سر تسلیم خم کرتے ہیں، لہٰذا وہ لکھتے ہیں:

''مال خسیس رابہ شعر نفیس بہ میزان برابر نباید سنجید، زیرا کہ مال دردست ہر کہ افتادہ است، وبال اوشد و خودرادر بار اوبست ، اما شعر دوستی است موافق طبع کہ جز باسازندہ خویش نسازد و جزبہ نامہ نیك نامی سازندہ خود نہ پردازد، وچراغی است کہ ہر گز ازباد حوادث نمیرد و از نفس ہیچ تاریك دل تاریکی نپذیر دو شمع است کہ در مجلس روشن دلان فرزند ہ خودرار خشندہ دارد، جانی است کہ تا قیامت صاحب شہود راز ندہ دارد، وفاداری است کہ گویند گان راہر کجار و دنام منشی خویش خواند۔'' (دیباچہ دیوان ''غرۃ الکمال'' امیر خسرؔو بکوشش سید وزیرالحسن عابدی، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۳۲)

مندرجہ بالا سطور سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امیر خسرؔو شعر و شاعری کو کس اعلیٰ درجے پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ انہوں نے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے وقت عربی و فارسی شاعری کے درمیان موازنہ ومحاسبہ بھی کیا ہے اور گوناگوں دلائل و براہین کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ عربی زبان مذہبی نقطہ نظر سے بلاشبہ دنیا کی سب سے پیاری اور بہترین زبان ہے، لیکن اگر شعر وادب کی بات کی جائے تو فارسی شعر وادب کو عربی شاعری پر ترجیح وتفوق حاصل ہے، انہوں نے عربی پر فارسی کی فوقیت کے اسباب بھی بیان کئے ہیں، جو بہت محکم اور مستند ہیں، جن کو نظر انداز کر پانا قدرے مشکل بلکہ بعض اعتبار سے تو ناممکن نظر آتا ہے، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

''عربی میں ہزار الفاظ کے ایک معنی ہیں اور ایک معنی کے لیے ہزار الفاظ ہیں، فارسی میں یہ وسعت نہیں ہے، لیکن فارسی شاعری اپنی تنگ دامانی کے باوجود عربی شاعری پر فوقیت رکھتی ہے، اس برتری کی ایک وجہ تو وزن کا اہتمام ہے، شعر کو بحر اور وزن کے اندر رکھا جاتا ہے، عربی میں زحاف کی اجازت ہے جس کی وجہ سے مصرعے ہم وزن نہیں رہتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل ایران نے قافیہ کے ساتھ ردیف کو ایجاد کیا ہے جس سے شعر کے آہنگ و دلکشی میں اضافہ ہوا۔ دینی اعتبار سے عربی کو تقدس حاصل ہے، لیکن ادب اور شاعری کے اعتبار سے فارسی کا پلہ ردیف کی ایجاد کے باعث بھاری ہے۔''

(دیباچہ غرۃ الکمال امیر خسرؔو مترجم پروفیسر لطیف اللہ، ص ۳۲)

امیر خسرؔو کے نزدیک شعر میں دانائی یا گہرائی پیدا کرنا بہت ہی مشکل کام ہے اور بعض اوقات تو شاعر کی پوری عمر گزر جانے کے بعد بھی اس کے کلام میں آفاقیت پیدا نہیں ہو پاتی اور وہ صرف نام کا شاعر بن کر اپنی زندگی گزارتا ہے اور سوائے اپنی عمر برباد کرنے کے کچھ اور نہیں کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شعر میں ہمہ گیری و آفاقیت یا گہرائی پیدا ہونے کے پانچ سبب ہوتے ہیں اور انہیں اسباب کی وجہ سے کسی شاعر کا کوئی شعر اعلیٰ اور معیاری قرار دیا جاسکتا ہے۔

شعر کی آفاقیت کی اولین شرط علم وفضل ہے، یہی وہ وسیلہ ہے جس کی مدد سے کوئی شاعر لفظی صنائع کی مدد سے شعر کی زیبائی افزوں کرتا ہے جو شعر کی مقبولیت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ شاعری میں حکیمانہ نقطہ نظر سے شعر کہنے کی کوشش کی جاتی ہے، شعر میں جتنی زیادہ حکمت کی کارفرمائی ہوتی ہے شعر اتنا ہی بلند اور اعلیٰ درجہ تصور کیا جاتا

ہے، بغیر حکیمانہ نقطۂ نظر کے شعر میں جاذبیت پیدا نہیں کی جاسکتی۔

نیک طبعی شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اسی کے تحت وہ تازہ غزلیں یا جدید شاعری پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی شاعر کا مزاج اس طرح ہونا چاہئے جس کی مدد سے وہ شعر جیسی لطیف صنف کے ساتھ انصاف کرسکے یا اس حق ادا کرسکے۔

خسرو نے شعر میں آفاقیت کے سہ گانہ اسباب ''فاضلانہ''، ''حکیمانہ'' اور ''نیک طبعانہ'' کی مذکورہ وضاحت کے بعد مزید دو اسباب یعنی ''عاشقانہ'' و ''دانش شاعرانہ'' کے تعلق سے لکھا ہے کہ شاعر سوختہ جان ہو کر شعر کہتا ہے یعنی شاعر کے دل میں عشق کا دریا موجزن ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کلام میں شدت وحدت پیدا کی جاسکے، جو شاعر عشق کے درست معنی مفہوم سے آشنا نہیں ہے وہ عمدہ شعر کہنے کا اہل نہیں ہوسکتا ہے اور پھر دانش شاعرانہ وہ وسیلہ ہے، جس میں شاعر، دانشورانہ جملوں کو استعمال کرنے میں کمال کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے یعنی شاعر اپنے کثرت مطالعہ اور دانشوری کو بروئے کار لا کر شعر کہنے کی کوشش کرے تاکہ اس کے یہاں جدت وندرت پیدا ہوسکے، کیوں کہ وہ کلام جو تروتازگی سے عاری ہوتا ہے، سننے یا پڑھنے والے کو کسی قسم کے لطف و انبساط کی کیفیت سے ہمکنار نہیں کرسکتا اور نہ ہی عقل و دانشوری سے عاری شعر کی عمر طویل ہوسکتی ہے۔

امیر خسرو نے شعر و شاعری کی خوبیوں و خامیوں کے متعلق جن بصیرت افروز نکات کو پیش کیا ہے وہ یقیناً آج بھی سزاوار التفات ہیں۔ انہوں نے نقد شعر کے متعلق دانشوروں کے نظریات کا اجمالی طور پر جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''صورت یا بس''، شعر کی وہ اولین کیفیت یا صورت ہے اس میں شاعر کی طرف سے صنائع لفظی کے متعلق نشاندہی کی جاتی ہے یعنی شاعر اس موقع پر شعر کے لفظی محاسن یا صنائع لفظی پر زیادہ توجہ صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اور صنائع لفظی کی مدد سے شعر میں حسن پیدا کرتا ہے، جب کہ دوسری ''صورت معتدل'' وہ ہے جس میں رعایت لفظی پر توجہ صرف کی جاتی ہے یعنی شاعر الفاظ کے دروبست اور ان کے بہترین استعمال پر خصوصی توجہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شعر کا اصل کمال یا اس کا اصل حسن الفاظ کا درست استعمال ہوتا ہے۔

تیسری صورت ''صورت رطب'' ہے جس میں عموماً سادگی و سلاست کو بروئے کار لایا جاتا ہے یعنی الفاظ وصنعتوں کی بازیگری کے بجائے سادگی وروانی شعر پر زیادہ توجہ صرف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ شعر عام فہم ہو کر عام سامعین سے خراج تحسین وصول کرسکے اور چوتھی صورت ''صورت محرق'' ہے جس میں شاعر اپنے دل کی گہرائیوں سے نئے مضامین کشید کر کے لاتا ہے اور پھر شعر کہتا ہے۔

خسرو کے مطابق یہ آسان کام نہیں ہے کیوں کہ کوئی بھی

شعر و ادب میں ہیرو کا تصور

''شعر و ادب میں ہیرو کے عروج کا تصور ہماری تہذیبی اور تمدنی زندگی کے ساتھ اُبھرتا رہا ہے۔ کارلائل نے اپنے مشہور لکچروں میں ہیرو کی چھ قسموں پر بڑی تفصیل سے بحث کی تھی۔ اس کے مطابق انسانی تمدن کے بچپن میں ہیرو کا تصور الوہی رہتا ہے، تب انسان اپنے ہیرو میں دیوتا کے رمز پا کر اس کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ ہیرو کے سلسلے میں یہ ابتدائی تصور انتہائی عرش نشیں تھا، مگر انسانی ارتقا کے ساتھ ہیرو کی عرش نشینی آب وگل کی مادیت سے جیسے جیسے دوچار ہوتی ہے، ہیرو کا ارتقا بھی ارضیت سے ہمکنار ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ دیوتا سے پیغمبر بن جاتا ہے، چونکہ شاعری اور پیغمبری میں بال برابر ہی فرق سمجھا جاتا رہا ہے، اس لئے ہیرو کا مرتبہ شاعر کو بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ میں آکر جب کائنات کا رمز مذہبی تصورات سے مصفا اور منزہ ہونے لگتا ہے تو سوسائٹی مصلحین اور واعظین کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہے اور ان میں ہیرو کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ جب عقلیت کا بول بالا ہوتا ہے تو پھر عالموں کی قدر بھی ہونے لگتی ہے۔ مفکرین بھی اس طرح ہیرو کے زمرے میں آنے لگتے ہیں اور جب آخر میں انسانوں کے بیچ فتوحات کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور ملک در ملک جب فرد نام کماتا چلا جاتا ہے تو شاہی کے اُبھرتے تصور میں ہیرو کے نقش اُبھرنے لگتے ہیں۔ کارلائل نے یہ اقسام انیسویں صدی میں متعین کی تھیں۔ اس وقت یورپ کے فکری نظام میں ہیرو کا یہی تصور قائم کیا جاسکتا

تازہ اور اچھوتی بات کہنے کے لیے شاعر کو بڑی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے، تبھی جا کر وہ کوئی ایسی بات کہہ پاتا ہے جو سننے یا پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنالے۔

اس کے علاوہ امیر خسرو نے شاعری اور موسیقی کے باہمی ارتباط اور تعلق پر بھی گفتگو کی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ان کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک موسیقار اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ موسیقی کے پردے شعر سے موافقت نہ کریں اور نہ ہی ایک عمدہ شعر اس وقت تک لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے جب تک کہ اس کو موسیقار اپنے سروں میں ڈھال کر گنگنانا نہ شروع کردے۔ موسیقی سے شعر کا حسن اپنے کمال کی انتہا پر پہنچتا ہے اور شاعری کے سبب موسیقی کو اعتبار حاصل ہوتا ہے، شعر اور موسیقی ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتے ہیں، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ بے حد ضروری ہے۔

اِس کے علاوہ امیر خسرو نے شاعروں کے درجات بھی قائم کئے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ شاعر تین قسم کے ہوتے ہیں۔ یعنی ''استاد تمام''، ''استاد ناتمام'' اور ''استاد سارق''۔

''استاد تمام'' ایسا شاعر ہے جو کسی خاص طرز کا خود ہی موجد ہو یعنی اس نے اپنا ایک انفرادی انداز بیان اختیار کیا ہو اور اسی کے مطابق سخن سرائی کرتا ہو اور اس نے دیگر شعرا کا رنگ و آہنگ اختیار کرنے کی کوشش نہ کی ہو، جب کہ ''استاد ناتمام'' کسی مخصوص شاعر کے طرز کی پیروی کرنے والا ہے، جس کا اپنا کوئی مخصوص رنگ و آہنگ نہ ہو بلکہ دیگر شاعروں کی روش اور طرز سے متاثر ہو کر انہیں کے رنگ میں ڈوب کر شعر کہنے کی کوشش کرتا ہو اور پھر ''استاد سارق'' کے زمرے میں وہ شعرا آتے ہیں جو خود تو شاعرانہ صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں، لیکن دوسرے شاعروں کے کلام میں تبدیلیاں لا کر اس کو اپنا بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور دنیا میں لا اعتبار رہتے ہیں۔ خسرو کے نزدیک ایسے شاعر لائق مذمت بلکہ لائق ندامت ہیں جو دوسرے شعرا کے مضامین چرا کر اپنے الفاظ میں ڈھال کر انہیں دنیا کے نزدیک پیش کرتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ امیر خسرو کی ناقدانہ بصیرت بلاشبہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا کمیاب بلکہ نایاب پہلو ہے جس کی آبیاری کے لئے انہوں نے اپنے جگر کو خون کیا ہے اور یہ ان کے افکار و نظریات کی ہمہ گیری اور آفاقیت ہی ہے، جس کے سبب آج طول وطویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ان کی مقبولیت اور معنویت میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ دن بہ دن بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ ❁❁

تھا۔ کم وبیش یہ فکر ایشیا پر بھی منطبق ہوسکتی ہے۔ یہاں پر ارسطو کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی بوطیقا میں ہیرو کا جو اخلاقی تصور خوب اور ناخوب کے سہارے اُبھارا تھا اس نے ادب کا سب سے پہلا ضابطہ تصور ہونے کے باوجود لوگوں کو اپنی طرف بہت کم توجہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوئی کہ فطرت کے خیر و قہر اور کبھی کبھی اس پر فتح پا جانے کا نشہ انسان کو وہم و خیال سے قریب تر کرتا گیا اور وہ ہیرو کے طلسماتی جال میں پھنستا گیا۔ کارلائل اسی طلسم کے دائرے میں اپنے ان چھ قسم کے ہیرو کو دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ اس چھٹے تصور کی سب سے بہتر مثال ہمیں اردو میں ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' میں ملتی ہے۔ قدیم اردو ادب ہیرو پرستی کے اس تصور کے علاوہ ایک دوسرے تصور سے بھی کافی متاثر رہا ہے۔ یہ تصور خالص ایرانی ہے۔ اِس تصور کی پشت پر عشق کا جذبہ اپنی تمام ماورائیت کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ اس کی رمزیت میں کچھ کیا بہت کچھ صوفیت کے اثرات در آئے ہیں۔ 'قصہ چہار درویش' کی روایت میں جو مجنونانہ انداز نظر آتا ہے، اس نے فردوسی کے شاہنامہ کی روایت کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یوں نکلا کہ جب میر تقی میر اپنے ہیرو پرسرام اور گجراتی افغان کو مرکزیت عطا کرتے ہیں تو وہ ہمیں انفعالیت اور مجہولیت کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات کا بھرم قائم کرنے کے لئے شعلوں کو خاکستر کرنے کی بجائے شعلوں میں بھسم ہو جاتا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسلی طور پر میر کا ہیرو آریائی نہیں بلکہ دراوڈی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہیرو کی سراپا نگاری حسن بداماں ہوگئی ہے۔'' (ماخوذ از مقالہ بہ عنوان ''مثنوی کے پرانے ہیرو'' ڈاکٹر افصح ظفر، سہ ماہی ''زبان وادب'' پٹنہ، ج ۴ ش ۷، جولائی ۱۹۷۷ء، ص ۴۵ و ص ۴۶)

ڈاکٹر آسیہ پروین
C/o Md. Shahid Ghazanfar, Moh. Imadpur, Biharsharif, Nalanda 803101 (Mob.9386707207)

شمیم صادقہ: کرچیاں سے صحرے کی پیاس تک

زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے ـــــ اور جب کسی کے بارے میں یہ خبر عورتوں تک پہنچتی ہے تو وہ اسے اپنے قدیم محاورے کی زبان میں ''سناؤنی آنا'' کہتی ہیں، شاید دل کے اِس جذبے کی تسکین کے لئے کہ خدا کرے یہ خبر سچی نہ ہو، سنی سنائی ہو، مگر موت ایک حقیقت ہے اور بھلا محاورے کی پناہ لینے سے کہیں یہ اٹل سچائی بدل سکتی ہے؟ اس کا جواب کل بھی نفی میں تھا، آج بھی نفی میں ہے اور کل بھی نفی میں رہے گا کہ اللہ کی کتاب کا یہ کھلا اعلان ہر دور کے لئے ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا مزا چکھنا ہے، مہد سے شروع ہونے والا سفر، مرد ہو یا عورت ایک نہ ایک دن لحد تک پہنچتا ہے اور اس کا نام صحافتی اصطلاح کے بموجب سیاہ حاشیہ میں آہی جاتا ہے، شمیم صادقہ بھی ایک ایسا ہی نام تھا جسے ۲۰۲۵ء کے اگست کا مہینہ جاتے جاتے سیاہ حاشیہ میں ڈال گیا۔

افسانہ اور افسانہ تنقید پڑھنے کے شوق نے اس نام کو، بہتوں کی طرح میرے لئے بھی اجنبی نہیں رکھا تھا، البتہ وہ خاتون جو اپنی سند کے لحاظ سے ڈاکٹر شمیم صادقہ تھیں اور اپنے منصب کے لحاظ سے پروفیسر شمیم صادقہ، یوں میرے لئے اجنبی رہیں کہ اُن سے آمنے سامنے کی باقاعدہ ملاقات تو کیا، شاید انہیں دور سے بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور اگر کبھی ایسا موقع ملا بھی ہو تو وہ حافظہ کی گرفت میں نہیں رہ سکا، البتہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا، اُن کا نام طالب علمی کے دور سے ہی سنا ہوا تھا اور اُن کی کچھ کہانیاں جب پرانے موقر جریدوں میں پڑھنے کو ملی تھیں تو اُن سے بروقت دو طرح کا تاثر بنا تھا۔ ایک تو یہ کہ جب ''میں''، ''تم'' اور ''وہ'' جیسے ضمائری کرداروں کے ساتھ ان کی بعض کہانیوں سے میں گزری تھی تو انہیں سمجھنے کے لئے بار بار پڑھنے کی زحمت اور پھر بھی کم کم ہی سمجھ میں آنے کی کلفت نے آگے سوچے بغیر رسالہ بند کر کے رکھ دینے یا کسی اور کہانی کی طرف مڑ جانے پر مجبور کر دیا تھا اور دوسرا تاثر یہ کہ جب اُن کی کہانی میں ''میں'' یعنی ذات کی تلاش کا عنصر سامنے آنے لگا تھا تو اس نے اُن کے افسانوی مجموعوں تک پہنچنے کی کچھ خواہش بھی پیدا کر دی تھی۔

شمیم صادقہ کی سوانح میں اگرچہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ آٹھویں کلاس میں پڑھنے کے زمانے سے ہی لکھنے لگی تھیں اور انہوں نے خود بتایا ہے کہ ان کی پہلی کہانی بمبئی کے ماہنامہ ''شاعر'' میں چھپی تھی، لیکن ایک جگہ چوں کہ اسکولی دور کی تحریر کا مزید کوئی ذکر نہیں اور دوسری جگہ، کہانی کا نام اور رسالہ کا سال اشاعت تحریر نہیں، اس لئے اُن کی باقاعدہ تصنیفی زندگی کا آغاز اُسی سال کے آس پاس سے ماننا، ہماری مجبوری ہو جاتی ہے جو اُن کے پہلے افسانوی مجموعہ ''کرچیاں'' کا سالِ اشاعت ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۹ء میں چھپا تھا جو یوں کہنا چاہیے کہ جدیدیت کے رجحان کی وَداعی کا قریب تر زمانہ ہے۔

یہاں تھوڑی دیر رُک کر اگر برسبیل تذکرہ یہ اشارہ ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں کہ ترقی پسندی کے بعد آنے والا جدیدیت کا رجحان اگرچہ دو دہائی کے آس پاس ہی کی عمر لے کر آیا، لیکن یہ بہرصورت ایک بہت ہی توانا ادبی رجحان تھا جس نے نہ صرف دیکھتے ہی دیکھتے ایک نظریاتی اور فلسفیانہ تغیر عام کر دیا بلکہ قدیم روایتی ادبی سانچہ میں بھی شکست و ریخت کا شدید عمل بھی یہاں سے وہاں تک پھیلا دیا۔ بیشک بقول غلام رسول ساجد:

> ''جدیدیت اگرچہ کوئی تحریک نہیں، لیکن رجحان اور جذبے کی قیادت میں اُس نے شعر و ادب کو نئے موضوعات، نئی تراکیب، علامات کے لسانی استعمال اور استعارے اور تشبیہ میں نئے انداز کو اپنا کر ترقی پسند موضوعات اور اشتراکی اصطلاحات کے طلسم کو توڑ دیا۔''
>
> (اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ، ۱۹۹۷ء، ص ۴۱۵)

یہ کا تحول جس فلسفہ کے زیر اثر، وجود پذیر ہوا، وہ کیر کے گارڈ اور سارتر کا فلسفہ ''وجودیت'' ہے۔ اِسے پسند کرنے والوں نے:

''اپنی تخلیقات میں ایک قسم کی ارادی بے ترتیبی و بے لگامی سے کام لیا۔ وہ اپنے نظریات کو مبہم طریقے پر پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قارئین کو بے ترتیبی میں الجھا دیں تا کہ وہ خود اپنے طور پر اُس بات کی تہہ تک پہنچ سکیں جسے وہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وجودیت ہر آدمی سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ڈھونڈ نکالے دنیا کا سامنا کرے اور اپنے انجام کے لئے خود کو تیار رکھے۔'' (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، ج ا ص ۵۶۷)

اِس فلسفہ کے تحت ظاہر ہے کہ ''میں'' کی تلاش کا معاملہ سامنے آیا اور:

''۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں فکری اور فنی تقاضے نیا روپ اختیار کرنے لگے..... رومانیت سماجی معنویت کے راستے سے مڑ کر فرد کی طرف متوجہ ہوئی اور اس نئی رومانیت نے فلسفہ وجودیت اور خود اجنبیت کا سہارا لے کر باطن اور تلاش ذات کو فن کا موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ فنی سطح پر علامت کے استعمال پر زور دیا گیا اور شاعری اور افسانوی ادب دونوں میں علامتی پیرایہ اظہار نے قبول عام پایا۔ مقصد ادب میں کئی جہات کی معنویت پیدا کرنا تھا جس کی بیک وقت باطنی معنویت کے اعتبار سے توجیہہ کی جا سکے اور سماجی معنویت کے اعتبار بھی۔'' (اردو انسائیکلوپیڈیا، ج ا ص ۷۵، اشاعت اوّل ۱۹۹۶ء)

مذکورہ اقتباسات یہاں دانستہ نقل ہوئے ہیں، مقصود یہ دکھانا ہے کہ یہ مجموعی طور پر فکر و ہیئت کے تجربات کا ایک دور تھا جس سے اُس وقت کی نوجوان ادیبہ شمیم صادقہ نے ایک قریبی وراثت کے طور پر گہرا اثر قبول کیا، اگرچہ ان کے قلم سے اسے عملی رنگ دینے کا زمانہ آنے تک خود یہ تجرباتی دور، زوال کے حصار میں آ گیا، مگر کہنا چاہئے کہ بہار کے حوالے سے شاید وہ پہلی اور تنہا خاتون تھیں، جنہوں نے اس کے احیا میں پر جوش دلچسپی دکھایا اور اتنی سنجیدگی سے دکھایا کہ آج اُسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ''کرچیاں'' کی کہانیاں موضوعی لحاظ سے ''جدیدیت'' کی گرفت میں ہیں اور خصوصاً تلاش ذات کے مسئلے اور معاملے سے نبرد آزما۔ عینی کے ذریعہ اس کی تحسین کا ذکر مصنفہ نے کیا ہے اور اس کا پیش لفظ شکیلہ اختر کے قلم سے ہے، جو اس کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے شاید یہ نامناسب نہیں کہ ''کرچیاں'' سے ماخوذ دو اقتباس نقل کر دیے جائیں:

''میں رُک رُک کر لکھتی رہی..... زندگی کی اُلجھنوں نے جب جب مجھے ذہنی طور پر نڈھال کیا تو چند عزیزوں اور اپنوں نے..... دوستوں اور مہربانوں نے میری ہمت افزائی کر کے مجھے پھر سے اظہار کی بھٹی میں جھونک دیا ..... یوں میں اس کرب کو سمیٹنے کی کوشش میں بار بار بکھرتی رہی، یہاں تک کہ اب میں خود کو بھی پہچان نہیں پاتی۔ میں کیا ہوں؟ ایک سوالیہ نشان میرے اندر صلیب کی طرح آویزاں ہے۔''

''شمیم صادقہ افسانوں کو ایک نئے انداز سے سجانے کا آرٹ جانتی ہیں۔ ذہن کی دھیمی دھیمی سی آنچ ر جب

دل کے لہو پگھل پگھل کر آنسو بنتے ہیں اور پلکوں سے گرتے ہیں تب شمیم صادقہ کے افسانے جنم لیتے ہیں۔''

پہلا اقتباس کہنے کی ضرورت نہیں کہ خود مصنفہ کے قلم سے ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ مزاجاً شروع سے ہی انہوں نے کاتا اور لے دوڑی والا انداز نہیں اپنایا۔ حقیقت یہی ہے کہ صرف تحقیقی اور تنقیدی ادب کے لئے نہیں تخلیقی ادب کے لئے بھی سوچ سمجھ کر اور سنبھل سنبھل کر، رُک رُک کر لکھنے سے ہی خاص بات بنتی ہے اور شمیم صادقہ کی باقیات مجموعی لحاظ سے یہ بتا جاتی ہے کہ وہ بے تکان بولنے کی طرح بے تکان لکھنے کو بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور جاننے والوں نے اُن کی وضع داری اور منکسر مزاجی کے ساتھ ساتھ اُن کی کم گوئی کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ اصلاً ایک شہادت ہے جس سے ان کی تحریر اور ان کی شخصیت میں ایک قسم کے تال میل کا لطیف اشارہ مل جاتا ہے۔

مشمولہ اقتباس میں انہوں نے نہ صرف اپنے خاص ادبی حلقہ کا مخلصانہ کردار سامنے لا دیا ہے بلکہ اپنے اُس کرب کا بھی اشارہ دے دیا ہے جو اُن کے لئے افسانے لکھنے کا داعیہ پیدا کرتا رہا۔ گویا یہاں ظاہری اور باطنی دونوں ہی داعیات آئینہ ہو گئے ہیں اور آگے سوال آتا ہے وطیرۂ فن اور تاثیرِ فن کا، تو اِس کا جواب اُس دوسرے اقتباس میں یقیناً مل جاتا ہے جو شکیلہ اختر کے قلم سے ہے۔ وہ کیوں لکھتی ہیں، انہیں تحریک کہاں سے ملتی ہے، داعیہ کہاں سے آتا ہے، حوصلے کون دیتے ہیں، اُن کا آرٹ کیا ہے اور اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کی شدت اور اہمیت کس قدر ہے، ان تمام سوالوں کا جواب محولہ اقتباسات سے مل جاتا ہے۔

شمیم صادقہ کے مجموعہ ''کرچیاں'' کی اشاعت آج سے ۴۵ سال پہلے کی بات ہے، اُس وقت اِس کتاب کے ایک مبصر نے لکھا تھا:

''شمیم صادقہ کے افسانوں کا مجموعہ 'کرچیاں' یقیناً ان کے ذاتی کرب اور ان کی ذات کے بحران کا مصورنامہ ہے۔ ان کی اپنی ذات ہی ان کے بیشتر افسانوں کا مرکزی کردار ہے۔ اپنے ذاتی المیہ کو وسیع تناظر میں دیکھنے اور اپنے اندر کی ٹوٹن کو ماورائیت بخشنے کی سعی میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ انہوں نے عورت کی انا کو کئی رنگوں میں ڈھال کر اس کی تسکین کے لئے ایک مرد کامل کی تلاش کی ہے۔ ظاہر ہے اس نامکمل جہاں میں وہ مرد کامل ملنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔'' (آجکل، دہلی جولائی ۱۹۸۰ء ص ۸۸)

مرد کامل کی تلاش میں چاہے کامیابی داخل محال ہو، مگر اس کا مسلسل حوصلہ رکھنا بجائے خود ایک بڑی بات ہے اور ''کرچیاں'' ہی کیا، اُس کے بعد کا بھی سفر در سفر اپنے ایک ایک پڑاؤ پر رُک رُک کر یہی بتا رہا ہے کہ شمیم صادقہ کو منفرد طرز کی سوچ اور ہنرمندی نے ایک ایسا مقام بخشا ہے جو جدیدیت، خصوصاً اُس جدیدیت کے حوالے سے جو ترقی پسندی کی خاص حد تک توسیع کا مزاج و منہاج بھی رکھتی ہے، نہ تو یکسر بیزار و بیگانہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس حوالے سے خواتین افسانہ نگاروں میں پورے شرح صدر اور مطالعاتی طمانیت کے ساتھ کسی کو بہ آسانی تمام اُن کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں باتیں ''کرچیاں'' پر ہو رہی ہیں تو برسبیل تذکرہ یہ اقتباس بھی دیکھئے:

''شمیم صادقہ نے اپنے افسانوں میں اپنی ذات کے کرب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن آج کا ہر انسان اس المیہ کا شکار ہے۔ ہر شخص اپنے کو ادھورا ہی محسوس کرتا ہے اور آج کے زیادہ تر انسان کو 'میں کی تلاش' ہے اس لحاظ سے صادقہ کی ہر کہانی زندگی کے قریب تر ہے اور ان میں شعور اور لاشعور کی کشمکش ہر جگہ موجود ہے، ان کی کچھ کہانیاں تحلیل نفسی کی بہترین مثال بھی ہیں..... شمیم صادقہ کی ابتدائی کہانیوں میں کہانی پن کو ہر جگہ روا رکھا گیا ہے بعد میں ان کی کچھ کہانیاں علامتی ہو گئی ہیں جو شاید وقت اور حالات کے زیر اثر ہوئی ہیں، لیکن ان کہانیوں میں بھی وہ سب کچھ ہے جس کی تلاش قارئین کو ہوا کرتی ہے۔ تجرید اور ابہام سے وہ کوسوں دور ہیں، انہوں نے اپنی بعض کہانیوں میں پیار و محبت اور حسن و عشق کے جذبے کو موثر انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے..... شمیم صادقہ نے افسانہ نگاری کے ساتھ نا انصافی نہیں کی ہے۔ موضوع میں نیا پن نہ ہوتے

ہوئے بھی تکنیک اور طرز ادا کے سہارے وہ اپنے افسانوں میں دلچسپی قائم رکھتی ہیں، ان کی تحریر میں جو کشش ہے، اظہار بیان میں جو آنچ ہے وہ قارئین کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے اور یہی آنچ ادب وفن کی جان ہوتی ہے۔''

(بہار میں تخلیقی نثر، بہار میں اردو افسانہ، ڈاکٹر قیام نیر)

شمیم صادقہ کی ادبی زندگی کے لئے ۱۹۸۰ء کے آس پاس کا زمانہ بہت ہی مبارک رہا، اس لئے کہ محض دو تین سال کے اندر، ان کے متواتر تین مجموعے منظر عام پر آ گئے۔ سولہ افسانوں پر مشتمل ''کرچیاں'' کے محض سال بھر بعد وہ سات افسانوں پر مشتمل اپنا دوسرا مجموعہ ''ادھورے چہرے'' لے کر پڑھنے والوں کی بزم میں آئیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے بقول ڈاکٹر احمد صغیر:

''یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں 'کرچیاں' سے آگے بڑھ کر شمیم صادقہ کا فن نکھرا ہوا ہے۔ 'کرچیاں' کی طرح یہاں کرب وفا اور احساس نارسائی کی ٹیس نہیں بلکہ ان میں زندگی کے ادھورے پن کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس مجموعے کے کچھ افسانے علامتی ہیں، جو شاید وقت اور حالات کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں۔''

(بہار میں اردو فکشن: ایک تنقیدی مطالعہ، ص ۲۸۹)

پروفیسر شمیم صادقہ کی افسانہ نگاری اور خاص طور سے ان کے دوسرے مجموعے ''ادھورے چہرے'' کی باتیں کرتے ہوئے، نازیہ نوشاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ غلط نہیں کہ:

''یہ حقیقت ہے کہ شمیم صادقہ نے اپنے افسانوں میں ذات کا کرب پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو صرف ان کا المیہ نہیں بلکہ عصر حاضر کا المیہ ہے۔ کہیں پر ذات کی تنہائی کا کرب ہے تو کہیں آدھے اور ادھورے ہونے کا، اس لحاظ سے شمیم صادقہ کی کہانیاں آج کے حالات سے زیادہ قریب ہیں۔''

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس مجموعہ کا نام ہی جدیدیت کے موضوع سے غذا یافتہ ہے اور اس احساس کا اشارہ دے رہا ہے جو آج کے دور میں فرد کو ادھورے پن کے کرب سے دوچار بنائے ہوئے ہے۔

شمیم صادقہ کے ''آدھے چہرے'' ابھی اپنے قارئین کے لئے بالکل تروتازہ ہی تھے کہ انہوں نے اپنے تیسرے مجموعہ ''طرح دیگر'' سے بھی انہیں نواز دیا۔ بقول ڈاکٹر احمد صغیر، اس تیسرے مجموعہ میں شمیم صادقہ کا فن اپنے عروج پر ہے:

''شمیم صادقہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، شمیم صادقہ درد و کرب، ادھورے پن کو ہی موضوع بناتی ہیں، لیکن تکنیک، طرز ادا کے سہارے وہ اپنے افسانوں میں دلچسپی قائم رکھتی ہیں۔ اظہار بیان میں جو آنچ ہے اور ان کی تحریر میں جو کشش ہے وہ قارئین کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے اور یہی آنچ ادب وفن کی جان ہوتی ہے۔''

(بہار میں اردو فکشن ایک تنقیدی مطالعہ، ص ۲۸۹)

مذکورہ اقتباسات کا ماخذ، اُن کے ساتھ ہے اور اس میں دو رائے نہیں کہ یہاں جو تجزیہ ہوا ہے وہ اگرچہ شمیم صادقہ کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلو، اُن کے پہلے افسانوی مجموعہ کے حوالے سے سامنے لاتا ہے، لیکن اس کے بعد جب ہم اُن کے دیگر افسانوی مجموعوں کی طرف آتے ہیں تو ہمیں یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی کہ معمار نے خشت اول، چونکہ ٹیڑھی نہیں رکھی تھی، اس لئے اس کی اُٹھائی ہوئی دیوار کہیں ٹیڑھی نہیں ہوئی ہے۔

شمیم صادقہ کا تیسرا مجموعہ ''طرح دیگر'' بیس کہانیوں کا مجموعہ ہے اس مجموعے کے آغاز میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میں نہیں جانتی، لوگ تعارف کے طور پر کیا کہتے ہیں، میرا صحیح تعارف تو میری کہانیاں ہیں، میں تو صرف یہی جانتی ہوں کہ ایک جہنم میرے باہر ہے اور ایک میرے اندر اور جب ان دونوں شعلہ زاروں کے شعلے باہم ٹکرا جاتے ہیں تو عجیب سی بے کلی میرے اندر در آتی ہے۔ یہ تخلیقی کرب! جب کوئی پلاٹ صفحے پہ بکھیرتی ہوں تو لگتا ہے یہ سب سے اچھی کہانی ہے، اس موضوع پہ آج تک کسی نے کچھ نہیں لکھا، مگر جب لکھ لیتی ہوں اور پڑھ کے

دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے، کہنے والی بات تو رہ گئی اور پھر نئے تخلیقی کرب کا انتظار، پتہ نہیں وہ تخلیقی شاہکار کب وجود میں آئے گا، جس کے بعد انگلیوں کے قلم ہو جانے کا دُکھ نہیں ہوتا..... مجھے ہر ایک کہانی کے پس منظر میں وہ تاج محل جھانکتا نظر آتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھو جاتا ہے۔'طرح دیگر' کے افسانوں سے متعلق کوئی بھی وضاحت، قطعی غیر ضروری ہے، ان میں ٹوٹتی قدروں کی کراہ بھی ہے اور نئے اقدار کی چکا چوند بھی، انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ یہ دوسری نسل کا المیہ ہے، ابھی ہم پہلی نسل سے تحت الشعوری وابستگی سے بظاہر شعوری طور پر انحراف کر رہے ہیں، مگر ہر ایک کوشش ہمارے ہی اندر ایک تیکھی دھار والے شیشے کی طرح اُترتی جا رہی ہے، یہ ٹیس بھی ہم محسوس کرتے ہیں، ابھی فیصلہ کن وقت نہیں آیا، آج کی زندگی کہر آلود ہے۔ قدروں کی بیساکھی کو ہم احساس کمتری کی جکڑ بندی کی بنا پر دور پھینک چکے ہیں، پھر اندھی گلیوں میں ہم اوندھے منھ گر پڑے ہیں، اُٹھتے ہیں، پھر گرتے ہیں اور بے سمت سفر کیے جا رہے ہیں۔ مطلب صرف یہ کہ دوسری نسل کے سائے میں پروان چڑھتی ہوئی یہ تیسری نسل کیا ہوگی، ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے۔''

شمیم صادقہ کے تیسرے مجموعہ سے لیا گیا یہ اقتباس طویل ضرور ہے، لیکن اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ اس سے شمیم صادقہ کی کہانیوں کے اہم ترین پہلو خود اُنہیں کی زبانی نہایت خوبصورت لفظوں میں سامنے آجاتے ہیں اور یہ اندازہ لگا لینا بھی دشوار نہیں رہتا کہ اُن کی طرز نگارش میں کس بلا کا حسن ہے، کیسی بے پناہ انفرادیت ہے اور زمانے کو دیکھتے، سمجھتے، پرکھتے اور برتتے ہوئے اُن کے مستقبل کی خاطر سوچنے اور سنبھل جانے کا کیسا برجستہ پیغام ہے۔

غالبؔ نے ''عرش سے پرے اپنا مکاں'' ہونے کی آرزو کے ساتھ ''اک منظر اور بلندی پر'' بنا لینے کی بات کہی تھی اور حافظؔ نے ''سقف فلک'' میں شگاف کر کے ''طرح دیگر'' ڈالنے کی تمنائیں دکھائی تھیں اور اسے شمیم صادقہ کا حوصلہ ہی کہا جائے گا کہ غالبؔ و حافظؔ کی فکر سے کس طرح انہوں نے غذائیں لیا ہے اور کتنی گہری توجہ سے اردو افسانے کی دنیا کو کامیابی کے ساتھ آشنا بنانا چاہا ہے۔

افسانہ تنقید لکھنے والوں کے قلم سے بر سبیل تذکرہ شمیم صادقہ کی متعدد کہانیوں کے جو مختصر علمی تجزیے ہوتے رہے ہیں اور ان کی سوچ، ان کے بیان اور اُن کی زبان کے بارے میں جو کچھ اظہار خیال ہوتا رہا ہے، اُس سے مجموعی طور پر واضح تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ اُن کی کہانیاں نہ تو موضوعاتی بوقلمونیت سے تہی داماں ہیں اور نہ ہی اُن کے یہاں اسلوب و انداز کے اعتبار سے کہانی کی بنت سرتاسر اُس وطیرۂ فن کی اسیر رہی ہے جسے غالی جدیدیت پسندوں نے مرغوب رکھا ہے۔ اُن کے یہاں بعض تہدار اور بہت ہی تہدار کہانیاں ہیں تو کچھ ایسی سادہ اور سیدھی کہانیاں بھی جنہیں سمجھنے کے لئے ذہن کو تھکا دینے والی ورزش ہرگز درکار نہیں ہوتی ہے۔

انہوں نے ''کرچیاں'' بھی دکھائی ہیں تو سلیقے سے اور ''ادھورے چہرے'' بھی سامنے لایا ہے تو قرینے سے۔ اُن کی ''کرچیاں'' بکھرتی اور ٹوٹتی زندگی کے احساسات و جذبات کی کرچیاں ہیں اور اُن کے ادھورے چہرے، دراصل ادھوری زندگی کے چہرے ہیں۔

یہاں وجود کی سالمیت چکنا چور ہو چکی ہے اور شناخت کا مسئلہ ایک مہیب صورت اختیار کر گیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے تو ''چار چہرے'' سے کام چلا لیا تھا، لیکن شمیم صادقہ کے یہاں ایسی عددی کمیت بھی مٹ چکی ہے اور ایسی شناسائی کیفیت بھی جو پورے چہرے دکھا سکے۔ کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا گیا بھی ہے اور بار بار کہا گیا ہے کہ اُن کی کہانیاں فلسفہ وجودیت کے زیر اثر ہیں اور ان میں اپنی ذات کے کرب و بحران کو پیش کرنے کی سعی ہوئی ہے، لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بھی عہد بہر صورت انسانی نسلوں کا عہد ہوتا ہے اور کوئی بھی سماج فرد ہی سے بنتا ہے، لہٰذا ذات کا المیہ لازماً وقت اور معاشرے کا اور اس میں جینے بسنے والوں کی ایک ایک سانس کا المیہ بن جاتا ہے اور خاص طور سے طبقہ اناث کے احساسات و جذبات پر مسلسل کاری ضرب

لگا تا رہتا ہے اور اس کے لئے اپنے اندرون کا سفر گویا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ کٹھن بنا دیتا ہے۔

شمیم صادقہ کی کہانیاں یقیناً خلاؤں میں سانس نہیں لیتیں اور نہ ہی مفروضوں کے نان ونمک سے اُن کی پرورش ہوتی ہے بلکہ اُن کی اصل ڈور انہیں زندگی سے قریب تر رکھتی ہے اور وہ شعور ولاشعور کی مسلسل کشمکش میں گھری رہتی ہیں۔ بایں لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے لئے تحلیل نفسی کی نت نئی راہیں آئے دن بنتی چلی جاتی ہیں اور شمیم صادقہ جیسی حساس ادیبہ کے یہاں شاید کہ اُن کی عکاسی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔

اُن کی کہانیوں کا مطالعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ انہوں نے اپنے فن پاروں میں آغاز تحریر سے ہی کہانی پن کے ساتھ یکسر نفور کا رویہ نہیں اپنایا حتیٰ کہ بعد میں جب وقت وحالات کے زیر اثر انہیں علامتوں کا سہارا لینا پڑا، تب بھی انہوں نے تجرید اور ابہام کے پالنے میں اپنی کہانیوں کو جھولتے رہنے کے لئے چھوڑ دینا ہرگز گوارہ نہیں کیا۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدیدیت کے سکہ بند موضوعات کی اسیر ضرور ہوئیں، لیکن فن کے سانچہ کی سجی سجائی حویلی میں کسی مست ہاتھی کی طرح توڑ پھوڑ مچا دینا انہیں کبھی گوارہ نہیں ہوا۔

یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ جدیدیت پسندی نے شمیم صادقہ کی کہانیوں کو عموماً موضوع میں نیا پن جیسے عنصر سے دور دست ہی رکھا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہیے کہ اس صورت حال کے منفی اثرات کو انہوں نے تکنیک اور طرز ادا کے سہارے ممکنہ حد تک مثبت اثرات میں بدلنے پر توجہ دینے میں کمی نہیں آنے دی۔ اسے اپنی کہانیوں کے ساتھ شمیم صادقہ کا یک گونہ منصفانہ اور مساوات پسندانہ رویہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے نہ تو فکری لحاظ سے منکر خدا وجودیت کا فلسفیانہ اثر قبول کیا اور نہ ہی وجودیت پسندی کے زعم میں جدیدیت کا وہ لہجہ اپنایا جو کہانی کے لئے ریاضی کا فارمولہ اپنانے سے کم کسی بات پر مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ اسے یقینی طور سے پروفیسر شمیم صادقہ کی روشن ہنرمندی ہی کہا جائے گا کہ انہوں نے پریم چند کی روایتوں سے آنکھیں بند کر کے نہ تو کبھی اپنا رشتہ توڑا، نہ ہی کبھی کسی حد تک یہ رشتہ ٹوٹنے کے قریب آنے لگا تو اسے اپنی نئی یا اچھوتی کامیابی سمجھا۔

شمیم صادقہ یہ بات بخوبی جانتی تھیں کہ جب دلچسپی قائم نہیں رہ سکے تو کہانی چیستاں بن جاتی ہے اور کسی کام کی نہیں رہتی، یہی سبب ہے کہ انہوں نے بہرصورت کہانی کو کشش سے بیگانہ نہیں ہونے دیا ہے۔ ان کے یہاں اظہار بیان میں ایک ایسی آنچ ضرور ہے جو پڑھنے والوں کو دیر یا سویر پگھلانے لگتی ہے:

> ''واقعات کے نہاں خانے میں احساسات وکیفیات کی شدت اور دھیمی دھیمی رفتار شمیم کو افسانوں کے لئے آمادہ کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ واقعات عورت ومرد کے تصادم سے بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو جدائی، طلاق، وصل، نکاح، انتظار، بیقراری، ایذا رسانی، بے وفائی اور جنم جنم کے ساتھ اور فریب عمل اور ردعمل سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔'' (ماہنامہ 'شاعر' بمبئی افسانہ نمبر دسمبر ۱۹۸۱ ص ۳۲)

یہ بات اپنی جگہ کہ شمیم صادقہ کے افسانوں میں عام اردو متبادل اور متداول الفاظ رہتے ہوئے انگریزی الفاظ کو جگہ ملی ہے اور اسے ناقدین نے اسی طرح نامناسب کہا ہے، جس طرح کہ وہ ان کی کہانیوں کے شاعرانہ عناوین اور اُن کی کہانیوں میں جا بجا ملنے والے فکر افزا اور قول فیصل جیسے جملوں اور عبارتوں کے مداح رہے ہیں، لیکن سچ پوچھا جائے تو بجائے خود یہ محض ضمنی وذیلی نکات ہیں۔ اسی طرح اُن کے بعض افسانے پر راست نظر ڈالتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ اہم سہی، مگر وہ شمیم صادقہ کے فن کو محض ٹارچ کی روشنی میں دیکھنے اور دکھانے کے مصداق ہی کہلائیں گے۔ مثلاً ان کی کہانی ''ڈیڈ ہاؤس'' پر کلام حیدری کی یہ رائے دیکھئے:

> ''شمیم صادقہ کی یہ کہانی سادہ، خوبصورت اور گداز دل مرحوم کی نعمت سے آراستہ ہے۔ انگلینڈ کے اولڈ ہاؤس کا ایک اپنا حبس ہے اور نئی نسل کی آبا واجداد سے بے توجہی کے علاج کے طور پر اس کا وجود ہوا ہے۔ مغرب مسئلہ رکھتا ہے تو اس کا حل بھی تلاش کر لیتا ہے، چاہے وہ حل مکمل نہ ہو، مگر باحس قوم مکمل حل نہ بنا سکے تو جتنا بھر ممکن ہوا اتنا تو کر ہی لیتی ہے۔ ایک ہم ہندوستانی ہیں کہ بس

آئیڈیل رکھتے ہیں اور اپنے آئیڈیل کے لئے غلو بھی، نتیجے میں اولڈ ہاؤس بھی نہیں بنا پائے کہ جہاں بوڑھا پے بسر ہوسکیں۔ ہم تو اپنے گھر کو ڈیڈ ہاؤس بنا دیتے ہیں۔''

(ماہنامہ ''آہنگ'' گیا، فکشن نمبر، ص ۱۸۹)

ان میں جو باتیں ہیں ان سے بھلا انکار کا کیا سوال، لیکن یہ بہر حال ایک محدود نقشہ ہی دکھا رہا ہے، جب کہ وسیع تناظر میں دیکھیں تو ایسی بہت ساری باتیں ہوسکتی ہیں جو شمیم صادقہ کی کہانیوں کا موضوعی یا اسلوبیاتی جلوہ دکھا سکتی ہیں۔ میں کسی فن کار کی کسی خاص کہانی کے تجزیے کی اہمیت و افادیت اور اس کی ضرورت سے واقف بھی ہوں، اس کی قائل بھی اور خود ایسی کوششوں پر متوجہ بھی رہتی ہوں، لیکن فی الوقت بر سبیل تذکرہ میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ کسی ایک دو کہانی کا سہارا لے کر شمیم صادقہ کی افسانہ نگاری کے ممیّزات اور ملتزمات کما حقہٗ سامنے لانا ممکن نہیں۔

عام طور پر شمیم صادقہ کو جدیدیت پسند کہانی کار مانا جاتا ہے، لیکن اِسے کیا کہا جائے کہ قمر جہاں اُنہیں ''بنیادی طور پر ایک رومان مزاج افسانہ نگار'' بتاتی ہیں اور جہاں تک میری فہم کہتی ہے اِسے یکسر رَد بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کی کہانیوں میں کسی نہ کسی عنوان سے عشق و رومان کی جھلک آ ہی جاتی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ عکاسی گہرے نفسیاتی تجزیے سے نہ تو الگ تھلگ رہتی ہے اور نہ ہی اُسے ''میں'' کے حوالے سے بیگانہ کہا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شمیم صادقہ نے جس طرح راست بیانیہ اور تجریدی و علامتی بیانیہ دونوں ہی سے سروکار رکھا ہے۔ اِسی طرح اگرچہ ایک لحاظ سے اُن کے یہاں موضوع میں پتھر کے پاؤں جیسی کیفیت ضرور ہے، لیکن دوسرے لحاظ سے دیکھیں تو اُن کے یہاں بایں معنی عصری حسیت اور تجزیہ بداماں عصری مشاہدے بھی ہیں کہ اُنہوں نے کئی ایسے معاملات کو اپنے افسانوں میں لے رکھا ہے جو مغربی معاشرے کے اثرات کی دین ہیں اور ہمارے یہاں اُس ''سونے'' پر بے نام طریقے سے یا بے حسی کے رنگ و روغن سے مضحکہ خیز حد تک گویا ''ڈیڈ ہاؤس'' میں بیٹھ کر ''سہاگا'' چڑھایا جارہا ہے۔

اِس جہت سے اگر کسی نے یہ بات لکھی ہے تو غلط نہیں لکھی کہ سماج اور ذات کے درمیان خوشگوار ماحول بنانے کی کاوش ہی ان کا خاص موضوع ہے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ اِسے ہی مزید موثر بنائے رکھنے اور اُجاگر کرنے کے لئے انہوں نے بحیثیت خاتون، خواتین کی کسمپرسی اور ان کی تنہائی کا کرب ہی اپنے افسانوں میں ترجیحی طور سے نہیں دکھایا ہے، بلکہ اس تعلق سے ایسے نسائی کردار بھی خلق کئے ہیں جو یک گونہ اضطراری جذبے کے ساتھ، مرد کرداروں کے مدمقابل چلنے کی صلاحیت کا احساس ہی نہیں دلاتے بلکہ بروقت اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں، اسے بانداز دگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شمیم صادقہ کے افسانوں میں تانیثی رجحان کے حوالے سے عورتوں کے جذبے، اُن کی قوت وصلاحیت اور ان کی اقدام پسندی بھی موجود ہے۔ البتہ اِس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ شمیم صادقہ نے مرد کرداروں کے ساتھ انصاف کا حق ادا نہیں کیا ہے بلکہ اُنہیں اگر معاشرے میں اپنی خود غرضی سے دور کوئی ''آج کا گوتم'' بھی نظر آیا ہے تو اُسے سامنے لا دیا ہے۔ شمیم صادقہ کی کہانیوں کے تعلق سے یہ کہنا بجا ہے کہ:

> ''شمیم صادقہ کے لہجے میں تلخی ہے جو آج کے حالات سے عبارت ہے اور یہ تلخی ان کے تمام افسانوں میں نظر آتی ہے۔ 'ایک شام کا لہو' یا 'کرچیاں' جیسے افسانے اس پر دال ہیں۔ انہوں نے عام طور پر بنے بنائے سانچوں سے گریز کیا ہے اور اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ 'آج کا گوتم' بھی ان کی ایک یادگار کہانی ہے۔ اس افسانے میں شمیم صادقہ نے دوسرے کردار کو 'آج کے گوتم' کا نام دیا ہے جو اپنے جذبات اور خواہشات کو چھوڑ کر علیحدہ راستہ اختیار کرتا ہے۔ شمیم صادقہ نے کم افسانے لکھے، لیکن ان کے افسانوں نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ (نازیہ نوشاد، ''زبان و ادب''، نگارشات خواتین نمبر، جنوری تا اکتوبر ۲۰۱۰ء ص ۱۲ و ص ۱۳)

آج سے تقریباً چار دہائی پہلے کا وہ زمانہ جب ''کرچیاں'' اور ''ادھورے چہرے'' کے معاً بعد انہوں نے ''طرح دیگر'' کی طرف آنے اور اُسے غور وفکر کے دائرے میں لانے کی بات کی تھی، اصلاً ان کے فکری وفنی

عروج کا زمانہ تھا، ایسا زمانہ جو کسی فنکار کی تخلیقات پر باقاعدہ ادبی مکالمے قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلانے لگتا ہے اور غالباً یہ احساس عمل کے دائرے میں بھی آجاتا، مگر ایک طرف تو یہ ہوا کہ جدیدیت پسندی کا کریز تیزی سے ٹوٹ چلا اور اس سے بڑھ کر دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ خود شمیم صادقہ کے قلم نے طویل مدتی خود اختیاری خاموشی اختیار کر لیا، ایسی خاموشی جو شخصیت فراموشی کے دور کی چاہت رکھنے والوں کے پوبارہ کر دیا کرتی ہے۔

شمیم صادقہ کے تین مجموعوں کے بعد اُن کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''صحرے کی پیاس'' ۲۰۲۳ء میں یعنی تقریباً چالیس سال بعد جب سامنے آیا تو گویا ساری پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔اس کے ترتیب نگار ڈاکٹر اسلم جاوداں نے اپنی تحریر کو ''شمیم صادقہ: ایک بازیافت'' کا عنوان دیا ہے تو یقیناً اس میں بڑی معنویت ہے اور اس مجموعہ پر ایک مبصر کا یہ بیان بھی اہمیت سے خالی نہیں:

> ''بہرحال مصنفہ کے افسانوں کی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے کے عمل میں میرے ذاتی تاثرات یہ ہیں کہ ان کے افسانے اپنے سماج سے ان کی گہری وابستگی کے راست مظہر ہیں، جن میں ایک مخصوص سمت میں بطور خاص توجہ مبذول کی گئی ہے جہاں خواتین سے متعلق مختلف انداز و اطوار کے قصے ہی قصے ہیں، مثلاً رشتوں کے انتظار میں لڑکی کی بڑھتی ہوئی عمر، لڑکیوں پر ڈھائے جانے والے ستم، گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیوں کے احوال، گھر کے اندر پنپنے والے عشق کے مضر اثرات، حالات کے پیش نظر عورتوں کے ڈگر بدل دینے کے اقدام، لڑکیوں کی شادی کے بازار میں روپیوں کی تجارت، انسانی دردمندی کے عمل میں لڑکی کا مثبت کردار وغیرہ۔ اس کے علاوہ خواتین کے حوالے سے مردانہ شمولیت کے ہمراہ بھی کئی معاملات سے وابستگی کی سعی کی گئی ہے، مثلاً 'صحرے کی پیاس' افسانہ میں عشق کے بڑے اعلیٰ تصورات ہیں کہ عورت تو دوسرے مرد کے ساتھ گھر بسانے کے بعد بھی عاشق کے تصور کو بلند مقام عطا کرتی ہے، مگر اس کا عشق اس کے تصور کو یوں زمین بوس کر دیتا ہے کہ اپنے ماقبل کے عاشقی کے رشتے کے اعتبار سے اسے پانا چاہتا ہے۔ افسانہ 'آہ کو چاہئے' میں ایک ماں بیٹے کے ساتھ رشتے کے ایک ماموں کا کردار ہے جو بچے کے باپ کی موت کے بعد اس کی ماں کو جسم کا سودا کرنے والا بنا دیتا ہے۔ 'اُڑان' میں عورت کی بے راہ روی کا ذکر کیا گیا ہے جس کے سبب ایک محنتی آدمی خود کو پستول سے شوٹ کر لیتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ کے افسانہ 'آج کا فردوسی' میں ایک اعلیٰ افسر کی چاہت کا قصہ رقم ہے، جو بلا کا ایماندار ہے اور اپنی چاہت کی خاطر غلط فیصلے لینے کے سبب نوکری سے استعفیٰ دے دیتا ہے۔ عورت عورت کے مابین مثبت و منفی کردار و اطوار کو بھی اپنے ایک افسانہ 'سیاہ اور سفید' کے توسط سے پیش کرنے کی مصنفہ نے سعی کی ہے، جہاں ایک نئی بہو اگر لاپرواہ ہے تو پرانی بہو نیک ہے، یہی نہیں سوتیلی ماں کا کردار تو لائق ستائش ہے کہ وہ محبت کی مثال ہے۔ کچھ دوسرے موضوعات کی جانب بھی انہوں نے رخ کیا ہے جس میں عورت کے واسطے سے انہوں نے کرونا بیماری کے احوال درج کئے ہیں۔ 'بڑا بابو' افسانہ میں ایک اسکول ٹیچر کی حالت خستہ کا احاطہ کیا گیا ہے جہاں اسکول ہیڈ ماسٹر اور بڑا بابو کا اس کے تئیں غیر مصنفانہ رویہ ہے تو سکریٹریٹ میں انصاف کے لئے جانے پر لوٹ کی گرم بازاری کو دکھایا گیا ہے کہ سستے داموں غریب کے زیور تک بک جاتے ہیں۔ افسانہ 'ببول کے کانٹے' فرقہ وارانہ منافرت کے موضوع پر تحریر کیا گیا ہے۔ مزدوروں کے حوالے سے ہندوستان میں کثرت میں وحدت کے تصور کی جہاں بات کی گئی ہے، وہیں عہد حاضر کی تفریق انسانی کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ

جانوروں کے تعلق کی جھلکیاں ان کے افسانہ تھا خواب میں، بھی دیکھی جاسکتی ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو شمیم سادقہ کے یہاں موضوعات کی سطح پر خاصا تنوع ہے اپنی تحریری صلاحیت کے بوتے جنہیں وہ افسانوی پیکر عطا کر جاتی ہیں۔مصنفہ کے افسانوں کی زبان وبیان میں بھی کسی طرح کا مصنوعی پن نہیں ہے۔ وہ سادگی اور سہل بیانی کے ساتھ ترسیل کی الجھنوں سے مطالعہ گروں کو آزاد رکھ کر شوقِ مطالعہ کی راہیں ہموار کرنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔'' (مجلّہ ''زبان وادب''نومبر۲۰۲۴ء،ص۶۳وص۶۴)

شمیم صادقہ کا ''صحرے کی پیاس'' میں ڈوبا ہوا یہ مجموعہ میرے مطالعہ کی میز پر بس سامنے ہی رکھا ہے اور یہ چنداں دشوار نہ تھا کہ میں اس کی کہانیوں پر اپنے لفظوں میں اظہار خیال کرتی، مگر وقت اور محنت بچانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اور صرف اِس لئے میں نے یہ اقتباس نقل کر دینے کو ترجیح دیا ہے کہ اس میں کہنے کی تقریباً بیشتر باتیں کہہ دی گئی ہیں اور میں یہ بات بخوبی جانتی ہوں کہ ''فقط سرخی بدل دینے سے افسانہ نہ بدلا جائے گا'' کا معاملہ اٹل ہے۔

بیشک ''کرچیاں'' سے ''صحرے کی پیاس'' تک پروفیسر شمیم صادقہ نے ''اپنا افسانوی سفر جس کامیابی سے طے کیا، وہ اُسی طرح قابل رشک کہلائے گا، جس طرح کبھی اُن کی تیز گام مقبولیت وشہرت، ان کے معاصرین کے لئے لائق رشک بن گئی تھی۔شمیم صادقہ ابدی سفر پر جا چکیں، مگر اُن کے افسانوی فن پارے، اب بھی ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور جیسا کہ ''صحرے کی پیاس'' کے ترتیب نگار نے لکھا ہے، واقعی ضرورت اِس بات کی ہے کہ ''وضاحت وتفصیل اور تنقیدی فکر ونظر'' کے ساتھ اُن کے افسانوں پر تجزیاتی وتقابلی گفتگو کی جائے اور یہ دیکھا اور دکھایا جائے کہ رومانیت جب سماجی معنویت کی راہ سے مڑ کر فرد کی طرف آئی تب بھی اور پھر جب وہ مابعد جدیدیت کے دور میں آ گئی، تب بھی، فکر وہیئت کے تجربات اور باطنی معنویت اور سماجی معنویت کے اعتبار سے ڈاکٹر شمیم صادقہ کے افسانوں کی جگہ کتنی محکم واہم تھی، آج بھی کتنی بامعنی ہے اور کل بھی بہ قیاس اغلب کس طرح عمر دوام لانے کا امکان رکھتی ہے۔

❁❁❁

سنگ میل

چھوٹی سی بچی بالوں میں ربن باندھے، ہلکے گلابی رنگ کا پارٹی فراک پہنے باغیچے میں پھول توڑ توڑ کر فراک کی گھیر میں جمع کرتی جا رہی تھی۔شاداب چہرہ یافت کی طمانیت سے گلابی ہو رہا تھا۔وہ اتنی محو تھی کہ گرد وپیش کا احساس تک نہ تھا ـــــ پھول توڑتے، چنتے کب شام ہوگئی، پتہ بھی نہ چلا کہ دفعتاً اس کے پاپا نے پکارا ـــــ ''صبا'' ـــــ وہ چونکی۔اس کے بچپن کا نام توصبی تھا ـــــ 'صبا' اس کے کالج کے دنوں کا ایکوارڈ لفظ تھا ـــــ اکتسابی احساس اور دامن چھوٹ گیا۔سارے پھول بکھر گئے ـــــ شکایتی نظروں سے اپنے پاپا کی طرف دیکھا۔انتقامی احساس کے ترجمان الفاظ جلتے بالو میں ڈالے مکئی کے دانے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر شعور سے ٹکراتے رہے ـــــ گرچہ اس کے لب ساکت تھے، پھر بھی پاپا نے اس صورتحال کو محسوس کر لیا اور چپ چاپ لوٹ گئے۔ نئے احساسات کے تحت اس نے پھولوں کو پھر جھک کے اٹھانا چاہا۔ یکبارگی چونک اٹھی ـــــ وہ سب کے سب پتھر تھے، سخت کھدرے اور زخم لگانے والے۔ایسے زخم جو ناسور بن جاتے ہیں ـــــ اس نے گھبرا کے اپنے باپ کی طرف دیکھنا چاہا، مگر وہ جا چکے تھے۔وہ نڈھال سی آہستہ آہستہ چل پڑی، مکمل اندھیرا تھا، اس میں چلنے کی سکت نہ تھی کہ اس کے ہر قدم کے ساتھ پھولوں کا دکھ اور پتھروں کا کرب شریک تھا ـــــ پھول کا نام ونشان نہ تھا اور سارے پتھر خود سے زمین سے اُٹھ اُٹھ کر اس کے ذہن ودل کے راستے اس کے اندر داخل ہوتے جا رہے تھے، بلکہ ہو چکے تھے ـــــ اس نے تھکن کو سہارا دینے کے لئے اندھیرے میں ٹٹولا۔ایک سخت، مضبوط اور چوڑی شئے ہاتھوں سے ٹکرائی۔ 'غنیمت' کے احساس کے تحت وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور وقت کا سنگ میل اپنی کامیابی پہ کھل اٹھا۔ (طرح دیگر، شمیم صادقہ، ص۵۲وص۵۳)

ڈاکٹر نسیم احمد نسیمؔ

Near Mirshikari Toli, Masjid Kali Bagh, Bettiah - 845438 (Mob. 7011548240)

اردو کہانی میں انامیت کا رجحان

ترقی پسند تحریک کے بعد اردو ادب میں کئی ادبی رجحانات منصۂ شہود پر آئے اور ایک قلیل عرصے کے بعد اپنا اثر کھوتے چلے گئے، ان میں جدیدیت کا رجحان بھی تھا۔ یہ رجحان ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۷۰ء کے دوران اپنے عروج پر تھا، لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں نے یا تو جدیدیت کو چھوڑ دیا یا افسانہ نگاری ہی چھوڑ دی۔ ان میں جو سخت جان اور اوریجنل تھے اور اپنے آپ کو جاری رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنا رویہ تبدیل کیا اور سن ستری نسل کو Established کرنے اور شد و مد کے ساتھ ''انامیت'' کی اصطلاح کو رائج کرنے میں لگ گئے۔ ان کی اس انامیت کو طارق سعید جیسے لوگوں نے ان کا طرہ امتیاز قرار دیا۔ افسردگی، بے اطمینانی، خوف و دہشت اور جمود و تعطل کے کرب انگیز ماحول کو پیش کرنا ہی گویا انامیت کا نصب العین ٹھہرا۔

کچھ دنوں تک انامیت، انام نسل اور انام افسانے کا اچھا خاصا چرچا رہا۔ اس رویے کے تحت واضح طور پر داخلیت اور خارجیت کی آمیزش کے ساتھ ایک نئی راہ استوار کرنے کا کام کیا گیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے انحراف کرتے ہوئے ایک ایسے انداز و اسلوب کا دعویٰ کیا گیا جو خالص اپنے اندرون اور اپنے عہد کا آئینہ تھا۔ اس فکر و رویے کے بنیاد گزار شوکت حیات تھے۔ انھوں نے داخلی دنیا کی تنہائی اور خود آگاہی کے ساتھ سماج اور معاشرے کے حقائق سے ربط رکھنے کا عزم کیا۔ انھوں نے سچائی پیش کرنے کے مروجہ طریقوں کو تبدیل کیا اور نئے حقائق کو نئے انداز میں پیش کیا جس میں زندگی کی بے معنویت، محزونیت اور وجودی مسائل کو خصوصی طور پر اولیت دی گئی۔

اس رجحان کے پیش نظر انھوں نے ''بے دست و پا''، ''سبز منڈیر پر سیاہ کبوتر''، ''تین میڈک''، ''مسافت'' اور ''بانگ'' جیسے افسانے تخلیق کیے۔ ان افسانوں میں فرد اور معاشرہ کے ساتھ حیات و کائنات کے تمام کیف و کم کو سمیٹنے کی سعی کی گئی۔ چونکہ انھوں نے یہ کام ایک لفظ یعنی ''انامیت'' کو وضع کر کے کیا، اس لیے یہ رویہ ان کے نام کے ساتھ منسوب ہو گیا، حالانکہ یہ کوئی بالکل نئی بات نہیں تھی۔ شوکت حیات سے قبل یا ان کے معاصرین کے یہاں بھی یہ شئے پہلے سے موجود تھی اور جدیدیت کے عروج کے وقت بھی بعض افسانہ نگار ہر طرح کے حصار، پابندی اور ازم و فارمولا سے الگ ہو کر داخلی و خارجی کیفیات کو ٹھیک اسی طرح پیش کر رہے تھے جس طرح شوکت حیات چاہتے تھے، لیکن لفظ انامیت سے انھیں دور کا علاقہ نہ تھا۔ اس نسل کی شناخت بے نام (انام نہیں) نسل کی تھی۔ اس میں متعدد بڑے حساس اور باخبر افسانہ نگار شامل تھے۔ نئے پرانے کی کوئی درجہ بندی نہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ ستر کی دہائی میں لکھنے والے کئی افسانہ نگاروں کو یاد رکھا گیا، لیکن سنہ ستری نسل یعنی انامیت والی نسل کو استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ نتیجتاً ۱۹۶۰ء کے بعد ۱۹۸۰ء کو ہی ٹرننگ پوائنٹ کے طور پر قبول کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۸۰ء کے بعد والوں میں جہاں سلام بن رزاق، شوکت حیات، حسین الحق، شموئل احمد، انیس رفیع اور عبدالصمد کا شمار کیا گیا، وہیں مشرف عالم ذوقی، ساجد رشید، خورشید اکرم، صغیر رحمانی اور شاہد اختر جیسے بعد میں آنے والے افسانہ نگار بھی شامل ہو گئے۔

ابتدا میں انور قمر، قمر احسن، بلراج مین را، سریندر پرکاش، حمید سہروردی، انور عظیم، خالدہ اصغر، احمد ہمیش، علی امام اور شوکت حیات وغیرہ نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر بہت طمطراق کے ساتھ ''شب خون'' اور ''آہنگ'' کے مزاج اور رجحان کو اپنایا۔ مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد، خالدہ اصغر اور احمد ہمیش وغیرہ کو اس رجحان کا عروج تسلیم کیا گیا۔ وارث علوی اور گوپی چند نارنگ جیسے ناقدین نے ایک حد فاصل قائم کر کے انہی مذکورہ افسانہ نگاروں کے نام کے ساتھ اس دور کے خاتمے کا

اعلان کر دیا اور بعد میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت نامہ جاری کیا کہ اب علامت، تجرید اور تمثیل سے بھرپور افسانوں کا زمانہ لد گیا، اس لیے آئندہ سے سیدھے سادے اسلوب میں بیانیہ افسانے لکھے جائیں، لیکن یہ ہدایت اور تنبیہ اپنی جگہ پر رہی۔ تقریباً تمام جدیدیوں نے وقت کے مزاج کو سمجھا اور وہ خود ہی رفتہ رفتہ بیانیہ کی طرف راجع ہو گئے۔ ان میں صرف انور عظیم نے خود کو تادیر جاری رکھا۔ ماحول کی اس تبدیلی کے بعد بھی علامت، تجرید اور تمثیل جزواً ہی سہی اپنی جگہ پر رہی، لیکن ظاہر ہے جب رویہ بدلتا ہے تو انداز و اسلوب اور ڈکشن میں بھی تغیر و تبدل کا عمل جاری ہو جاتا ہے اور ہوا بھی یہی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا بیانیہ کی واپسی کے بعد شوکت حیات بھی تجرید اور علامت کو تجسیم کرنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن بیانیہ ذو معنیٰ اور تہہ دار ہو، اس امر پر بھی وہ توجہ دیتے رہے۔ شاید انھیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ راست بیانیہ کی حد درجہ تبلیغ و تشہیر میں کہیں نئی کہانیاں اپنی پہچان اور جوہر نہ کھو دیں اور کہانی کا ڈھانچہ پھر سے فرسودہ، سپاٹ اور از کار رفتہ نہ ہو جائے، اس لیے علامت کا باریک ہی سہی ایک اہتمام ضرور ہونا چاہئے، لیکن علامت کے اس محتاط التزام کے باوجود اصل میں شوکت حیات کا فن اس وقت ہی نکھرا جب وہ پوری طرح جدیدیت کے حصارے سے باہر آئے اور ''لا'' جیسی کہانیاں چھوڑ کر سہل بیانیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

شوکت کے یہاں جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے، احتجاج اور خود شناسی کا جذبہ غالب ہے۔ چونکہ وہ خود مزدور یونین سے باضابطہ جڑے رہے، اس لیے ان کے یہاں ذاتی مشاہدہ اور فن کا مناسب اور متوازن امتزاج بھی ہے۔ ان کے یہاں ایک دو نہیں، درجن بھر ایسی کہانیاں ہیں جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں کرتی ہیں۔ ''بانگ''، ''سرپٹ گھوڑا''، ''کوبڑ''، ''چیخیں''، ''رانی باغ''، ''ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم''، ''سیاہ چادریں''، ''گھونسلا''، ''گنبد کے کبوتر'' اور ''سچویشن سیریز'' و ''کیفیت سیریز'' کی کہانیاں اسی ضمن میں آتی ہیں۔

شوکت حیات مخفی پر عیاں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے یہاں انور خاں کی طرح لاتعلقی نہیں۔ وہ ہر جگہ پورے طور پر اپنے افسانوں میں موجود ہوتے ہیں۔ مہدی جعفر نے شوکت کے یہاں Obssession کا سراغ لگایا ہے، لیکن شوکت کے یہاں ان کے تشویشی نوعیت کے افسانے اوڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ خالص ان کے ذاتی تجربے کا حصہ ہیں۔ یہ Obssession کسی طور پر بھی Morbid یا Fabricated نہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں موجودہ نظام کی خامیوں کو جرأت اور سفاکی کے ساتھ اپنی خطیبانہ نثر کے سہارے اجاگر کیا ہے۔ مہدی جعفر اسے ہمہ دان بیانیہ بھی کہتے ہیں۔ سچ ہے کہ کہیں کہیں ان کی لمبی لمبی عبارتیں اور طول طویل اقتباسات بیانیہ کو بے اثر اور بے لطف بھی بنا دیتے ہیں، لیکن شوکت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کہیں بھی مصلح، مبلغ اور مفکر بننے کی شعوری کوشش نہیں کرتے۔ ان کا آرٹ ان عیوب کو بھی کچھ حد تک گوارا بنا دیتا ہے۔ ان کے یہاں نئے شعور، نئے تیور اور نئے لہجے کی جھلک صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ شوکت حیات کی فنکاری نے اردو کی نئی کہانی کا رشتہ نئی سماجی حقیقتوں سے جوڑا ہے۔ قمر رئیس بھی ان کی انفرادیت کے معترف ہیں۔ ان کے مطابق شوکت کے یہاں زندگی کی بنیادی حقیقتوں تک پہنچنے کی شدت اور تڑپ انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

اب کچھ باتیں ان کے نظریے سے متعلق ـــــ ابرار رحمانی شوکت حیات کو ترقی پسندی، جدیدیت اور دیگر تمام رجحانات سے مبرا اور منزہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق شوکت کبھی بھی کسی تحریک یا رجحان کے زیر اثر نہیں رہے، یہاں ایک بے محل مثال کے ذریعے انھوں نے شوکت کے درد و غم کو میرؔ کے درد و غم کی مانند مانا ہے، جب کہ میرؔ کا درد و غم ان کے لیے سرمایہ حیات ہے۔ میرؔ کے یہاں نہ احتجاج ہے اور نہ ٹکراؤ۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے شوکت حیات کے افسانوں کا غائر مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق شوکت ایک پروٹیسٹ کے فنکار ہیں ان کے یہاں ناہمواریوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ملتی ہے، گلہ نہیں ملتا بلکہ ان سے ٹکرانے کا عزم ملتا ہے۔ اس تجزیے کی روشنی میں ابرار رحمانی کے مفروضے کی کلیتاً نفی ہو جاتی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادیبوں کے یہاں اشتراکیت تو ہے، لیکن وہ لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے وہ تنگ آ کر اپنے آپ کو آزاد مارکسی مانتے ہیں۔ شوکت اکثر و

بیشتر اپنے یہاں ریڈیکل ازم کی بات کرتے ہیں۔ رسالہ (دنمان، دہلی) نے بھی انھیں فکری اور تحریری سطح پر ریڈیکل ثابت کیا ہے، لیکن یہ رویہ ان کی تخلیق اور تحریر میں تو مل جاتا ہے مگر عملی طور پر وہ ریڈیکل ازم سے کس قدر شغف رکھتے ہیں، یا رکھا کرتے تھے، فی الوقت اس پر مفصل گفتگو کا موقع نہیں، البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ صوبائی یا ملکی نظام کل کا ہو یا آج کا ان کے مابین زیادہ فرق نہیں۔ جہاں قدم قدم پر سمجھوتے کے لیے مجبور ہونا پڑے، جہاں Ideology Establishment کی خوراک بنتی رہے وہاں ریڈیکل ازم کے استحکام کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اور اردو کے ادیبوں کا ریڈیکل ہونا تو اور بھی مشکل ترین بات ہے۔ وہ اس لیے کہ اردو کے کمزور اور بے سروسامان ادیبوں کے لیے زمانے کے جبر سے لوہا لینے کی صورتحال ابھی ناپید ہے۔

میری دانست میں شوکت کے یہاں بنیادی مقصد احتجاج، خفگی، بے اطمینانی اور انتشار کا اظہار ہے اور وہ اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مرصع اور پر شکوہ زبان لکھ کر بھی اپنی کہانیوں کو فطری پن سے دور نہیں ہونے دیتے، جب کہ ان کے ہم سنوں اور ہم عصروں کے یہاں یہی مرصع اور پر شکوہ زبان کہانی کا تاثر زائل کرنے کا بڑا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی مکمل کرنے کے مرحلے میں کسی عجلت یا افراتفری کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں ایک فنکارانہ ٹھہراؤ ہے جو انھیں بہت متانت اور سلیقے کے ساتھ کہانی کے فطری انجام تک لے جاتا ہے۔ شوکت حیات کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے جدید تر افسانے کی پہلی دفعہ داغ بیل ڈالی اور موجودہ زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں پیش کرنے کا بالکل جداگانہ انداز اور اسلوب خلق کیا۔ ان کی اس اجتہادی روش نے نہ صرف ان کے معاصرین کو بلکہ ان کے سینئرز کو بھی متاثر کیا۔

اخیر میں یہ عرض ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں کے دو اہم طبقے ہیں۔ ایک طبقہ مغربی فکشن سے جزوی یا کلی طور پر استفادہ کرتا رہا ہے اور قارئین کو ہر طرح سے مرعوب کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا ہے، جب کہ دوسرا طبقہ اس معاملے میں محرومیت کا شکار ہے۔ وہ چونکہ مغربی ادبیات سے مستفید ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا اس لیے طوعاً کرہاً اپنے گردوپیش پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تصنع، فیشن زدگی اور خود فریبی دونوں جگہ ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں Originality کی زیادہ توقع عبث ہی ہوگی۔ ذاتی مشاہدہ اور حالات سے دوبدو ہونے کی ہمت کتنوں کے پاس ہوتی ہے؟ اور کتنے اس اذیت بھری پرخار راہ سے گزرتے ہیں؟ اور اگر گزرتے ہیں تو فن پر کس قدر قدرت رکھتے ہیں؟ یہ کچھ سوال ہیں، جو واقعی جواب طلب ہیں۔

شوکت حیات ان چند افسانہ نگاروں میں ہیں جن کے یہاں نہ مغرب کی چمک دمک ہے اور نہ اپنے گردوپیش کو بیان کرنے میں کوئی عار ہے۔ انھوں نے محض افسانہ بنانے کے لیے افسانے نہیں لکھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کو پورے طور پر جیا اور بھوگا ہے۔ شوکت نے اس زمین کی کوکھ سے اپنی کہانیاں پیدا کی جس پر چلتے چلتے، گھسٹتے گھسٹتے ان کے پاؤں زخمی ہوئے، تب جا کر اردو افسانے نے انھیں تھوڑی سی جگہ دی اور یہ تھوڑی سی جگہ بھی اتنی اہم ہے کہ اس کی تمنا لیے بہت سے فکشن نگار اپنے حصے کے تمام ماہ و سال گزار کر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے شوکت حیات کے افسانے موجودہ فکشن کو باوقار ثابت کرنے میں ہمہ وقت ممد و معاون ہوں گے۔ ❁❁

اقوال دانش

☆ حقیقی خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے اگر دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں اور چہکتی بولیاں کچھ کام نہیں دیتیں

☆ زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو پانا ہے اگر نفس دل پر فاتح ہو گیا تو سمجھو، دل مردہ ہے

☆ دشمنوں کے سامنے ایسی گفتگو کرو کہ اگر وہ دوست بن جائیں تو پھر تمہیں شرمسار نہ ہونا پڑے

☆ بہت سی چیزیں وہ ہیں جو انسان خود سیکھتا ہے اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسے وقت سکھا دیتا ہے

☆ دنیا میں عبرت دینے والی چیزیں تو نہ جانے کتنی ہی ہیں، مگر ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو ان سے عبرت لیتے ہیں۔

☆ وقت انصاف پسند ہوتا ہے، ہمیشہ ہمت اور حوصلہ سے کام لو اور زمانے کا رخ موڑ دو

ذکیہ مشہدی

F-1, Grand Pallavi Court, Judges Court Road, Patna - 800004 (Mob. 9939263613)

بچوں کا ادب: چند بنیادی اصول

تقریباً سبھی بچے کہانیاں اور نظمیں سننا پسند کرتے ہیں اور آج موبائل کے دور میں پڑھ بھی لیا کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کہانی سننے کے اس فطری رجحان کی آبیاری کی جائے اور انہیں اس طرح کی کہانیاں مہیا کرائی جائیں جن کی خاطر وہ پڑھنے کی طرف راغب ہوں۔ موبائل مغربی ممالک میں بھی ہے بلکہ یہ وہیں سے آیا ہے جیسے تقریباً سبھی سائنسی اختراعات آئی ہیں، لیکن ان ممالک میں بچوں کے لئے کہانی لکھنا کم نہیں ہوا۔ کچھ مصنّفین ہیں جو بچوں کے لیے ہی لکھتے چلے آرہے ہیں۔ جے کے رولنگ کے ہیری پوٹر سے ہم اردو والے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہ مصنفہ پرانے وقتوں کی نہیں ہیں۔ بات بچوں میں دلچسپی جگانے اور انہیں پرنٹ میڈیا کی طرف جھکا لینے کی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو میں بچوں کی کہانیاں کم لکھی جارہی ہیں اور جو لکھی جارہی ہیں ان میں سے بیش تر اس معیار پر پوری نہیں اترتیں جو بچوں کے لیے ہونا چاہئے۔

بچوں کے لیے کہانی لکھتے وقت مصنف کو سب سے پہلے ذہن میں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ کس عمر کے لیے لکھ رہا ہے، پھر کہانی شروع سے آخر تک اس عمر کے مطابق چلنی چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ شروع تو کی کم عمر بچے کو ذہن میں رکھ کر اور درمیان میں آتے آتے وہ بڑی عمر میں داخل ہوگئی۔ یہاں بچپن کا تصور واضح کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

بچپن؟ ایام طفولیت یعنی صفر سے پانچ سال۔ بچپن ـــــ؟ یعنی چھ سے بارہ سال اور پھر تیرہ سے اٹھارہ تک عنفوان شباب میں منقسم ہے۔ تیرہ سے اٹھارہ کے درمیان بچے نو بالغوں (Adolescents) میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے مطالبات بالکل الگ ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کا مقصد یہاں صرف بارہ تیرہ سال کی عمر تک کے بچوں کے ادب کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے، کیوں کہ اس عمر میں بچے نشو ونما کے مختلف پہلوؤں جیسے ذہنی، لسانی، جذباتی اور سماجی نشو ونما سے گزرتے ہیں۔ ان کا خیال کر کے جو ادب تخلیق کیا جائے گا وہ ان کی اس نشو ونما میں مددگار ثابت ہوگا، علاوہ ازیں ان میں پڑھنے کے رجحان کو فروغ دے گا۔

بہت چھوٹے بچے جو ابھی حرف آشنا نہیں ہوتے، گرد و پیش کے ماحول میں پوری دلچسپی رکھتے ہیں۔ تجسس ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ وہ جو دیکھتے یا سنتے ہیں اسے جذب کرنا چاہتے ہیں اور جذب کرتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کے لیے بھی کہانیاں درکار ہوتی ہیں یہ انہیں پڑھ کر یا پھر یاد داشت سے سنائی جاتی ہیں۔ پڑھ کر سنائی جانے والی کہانیوں کا فائدہ یہ ہے کہ بچے تصویریں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور جن الفاظ کو وہ ان کی ٹھوس صورت میں دیکھ لیتے ہیں انہیں زیادہ اچھی طرح جذب کرتے ہیں۔

ایک کہانی میں نے ایک تین سالہ بچے کو کتاب سے پڑھ کر سنائی تھی۔ یہ انگریزی کی کتاب تھی۔ دراصل یہ ایک سلسلہ ہے، جس میں ایک درجن کہانیاں الگ الگ کتاب کی صورت میں ہیں۔ میں نے جو کہانی سنائی اس میں مرکزی کردار (جو ایک ننھا بھالو ہے) طوطا پالتا ہے۔ طوطا پنجرے میں ہے۔ اس کے سامنے ایک کٹوری میں دانا اور دوسری میں پانی ہے۔ طوطا خوش وخرم ہے۔ ننھا بھالو ایک پورے دن اسے دانا پانی نہیں دیتا۔ شام ہوتے ہوتے طوطا گردن ڈال دیتا ہے۔ اس کی دونوں کٹوریاں خالی ہیں۔ بھالو کی نظر پڑتی ہے تو وہ جلدی سے دوڑ کر دونوں چیزیں لاتا ہے۔ طوطا اٹھ جاتا ہے اور پھر تروتازہ ہو جاتا ہے۔ بھالو کی ماں کہتی ہے آئندہ طوطے کو مت بھولنا ـــــ اور کہانی ختم۔

جس تین سالہ بچے کو میں نے کہانی سنائی وہ میرا پوتا ہے۔ وہ کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اسے کھول کر ایک ایک تصویر کے بارے میں خود بتاتا، پھر وہی ٹیپ کا بند..... مجھے پوری کہانی سنایئے اور ٹیپ کا سوال:

''.....طوطا ٹھیک ہو گیا تھا نا؟''

''بالکل ٹھیک.....''

یہ سننے پر وہ بہت خوش ہو جاتا۔

اس سلسلے کی دوسری کہانیوں میں بھالو کا یہ بچہ مختلف چیزیں سیکھتا ہے، دانت برش کرنا، اپنی پسندیدہ چیز جیسے کیک دوسروں کے ساتھ مل بانٹ کر کھانا۔

کہانی کی یہ کتابیں ایک ننا سا خاتون کے گھر بھی ننھے بچوں نے سنیں اور جو پڑھنے لائق تھے، انھوں نے پڑھیں۔ بس چھوٹے چھوٹے جملے، بڑی بڑی تصویریں۔ کسی بچے نے یہ سوال نہیں کیا کہ بھالو کا بچہ کیک کیسے کھائے گا، وہ طوطا کہاں سے پالے گا، وہ دانت کیوں کر برش کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے ننھے بچے جانوروں میں انسانی خواص دیکھتے اور انہیں اپنے جیسا سمجھتے ہیں، تو چڑیاں بولتی ہیں، خرگوش اور گلہریاں دعوت اڑاتے ہیں، گوریا، کوے سے لڑنے چل پڑتی ہے، بطخ اپنے بچوں کو ڈانٹ پلاتی ہے۔ یہ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی، جس طرح افسانوں کے موضوعات آج تک ختم نہیں ہوئے، ایسے ہی بچوں کو لبھانے والے یہ موضوعات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ضرورت انہیں اس طرح پیش کرنے کی ہے کہ وہ دلچسپ معلوم ہوں، بچوں کی توجہ کھینچ سکیں۔ اردو میں اس طرح کی کہانیوں کی سخت ضرورت ہے۔

اب ذرا بڑے بچوں کو دیکھیں جو حرف شناس ہیں۔ معمولی نثر پڑھ سکتے ہیں یعنی سات آٹھ سال سے اور اس سے آگے کی عمر کے بچے۔ ان کے لیے کہانیاں سبق آموز ہو سکتی ہیں اور معلومات افزا، کچھ نہیں تو محض تفنن طبع کے لیے۔

یہاں کہانی کے مقصد کو دیکھیں، بچوں کے لیے لکھی گئی کہانی کا اولیں مقصد انہیں ذہنی انبساط بخشنا ہے۔ کہانی سن کر یا پڑھ کر انہیں خوشی حاصل ہونی چاہئے۔ وہ ہنس لیں، مسکرا لیں یا صرف دل ہی دل میں خوش ہو لیں۔ اس کے لیے کہانی آسان زبان میں ہو، اس میں مزاح کا تھوڑا سا عنصر ہو، موضوع دلچسپی کا حامل ہو تو مصنف کامیاب ہے، لیکن غور کیجئے کہ یہ مقصد تنہا نہیں ہے۔ بچوں کی لفظیات میں اضافہ ہوتا ہے، وہ اپنے گرد و پیش سے جڑتے ہیں، ہمدردی، چیزیں ساجھا کرنا، دوسروں کی مدد کرنا جیسے اخلاقی اصول بالکل بلا واسطہ طریقے سے ان کے اندر گھلتے ملتے چلے جاتے ہیں۔

کچھ کہانیاں چھوٹے چھوٹے سائنسی اصولوں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔ آپ یہی بات براہ راست بتائیں تو اتنی آسانی سے نہیں سیکھی جائے گی۔ میں بہت ابتدائی اصولوں کی بات کر رہی ہوں، جیسے خاکسار کی دو کہانیاں ہیں ایک تو ''روٹی کیوں پھولتی ہے؟'' اور دوسری ''دادی کی بکری۔'' ان دونوں میں سائنس کے ابتدائی اصول ہیں۔ سائنس کے موضوعات پر جناب شمس الاسلام مرحوم نے اردو میں بچوں کے لیے کئی کہانیاں لکھی ہیں۔

۲۰۱۵ء میں بچوں کے ادب کی ایک ورکشاپ میں ان سے ملنے کا موقع ملا تھا تو انہوں نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک ننھے سے کیڑے کے تعلق سے بچوں کو بتایا تھا یہ کیڑا مٹی سے اپنا ایک ٹیوب جیسا گھر بناتا اور اس میں اپنے بچوں کے لیے مکڑی پکڑ کر رکھ دیتا ہے۔ انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو وہ اس مکڑی پر پلتے ہیں پھر بڑے ہو کر باہر آجاتے ہیں۔ یہ عام زبان میں گوہری یا انجن ہاری کہلاتا ہے، انگریزی میں اسے ڈرٹ ڈابر (dirt dauber) کہتے ہیں۔

اس طرح کی کہانیاں گرد و پیش کے حقائق کا علم بھی دیتی ہیں اور دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتی ہیں۔ زبان پر دسترس پیدا کرنے میں تو سبھی کہانیاں معاون ہوتی ہیں، لیکن میرا فوکس فی الحال پانچ سے دس بارہ برس کے بچوں کے لیے لکھے جانے والے ادب پر ہے۔ ان کے لیے براہ راست نصیحت آمیز کہانیاں جن میں موٹے موٹے الفاظ ہوں، ہرگز مت لکھئے۔ سادہ زبان، آٹھ سے نو الفاظ کے جملے اور دلچسپ موضوعات کو منتخب کیجئے۔ ان میں کوئی سبق اندر ہی اندر پرویا ہوا ہو سکتا ہے۔ وہ بچوں پر رائیگاں نہیں جائے گا۔ کہیں نہ کہیں وہ ان کی سائیکی میں اثر چھوڑے گا۔ متن میں تدریجی طور پر نئے الفاظ متعارف کرانے چاہئیں، وہ بھی ضروری ہے، لیکن یہ نہیں کہ آپ خار مغیلاں اور آتش زیر پا یا عندلیب گلشن نا آفریدہ لے آئیں۔

براہ راست مخاطب کر کے بھی کہانیاں نہیں لکھی جانی چاہئیں۔ مثلاً بچو! تمہیں معلوم ہوگا ..... یا بچو، آؤ تمہیں بتائیں، والدین کی

نافرمانی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ طرز تخاطب کہانی میں اکتاہٹ پیدا کرتا ہے۔نثر کو بوجھل بناتا ہے۔آج کے اس دور میں جب اردو پہلے جیسی مقبول نہیں ہے، بچوں کو اردو کی طرف مائل کرنے کے لیے کہانیوں کو دلچسپ اور ہلکا پھلکا بنانا ضروری ہے۔ایک مرتبہ وہ چل نکلیں تو پھر قدرے سنجیدہ اور نسبتاً بھاری لفظیات والے متن سے بھا گیں گے نہیں۔

ایک اور بات جو منفی کے زمرے میں آتی ہے، وہ ہے کہانیوں میں تشدد یا جارحانہ قسم کی شرارتیں۔مثلاً جانوروں پر پتھر چلانا، لوگوں کے پیچھے جا کر چپکے سے پٹاخے چلانا، توہین آمیز جملے یا نام استعمال کرنا۔کسی کے جسمانی عیب کو بنا بنا کر اس کی توہین کرنا۔اگر اس طرح کی کوئی چیز سیاق وسباق کے اعتبار سے ضروری ہو تو پھر آگے اسے غلط ثابت کرنے والا متن بھی آجانا چاہئے۔آج کل کئی پرانی کہاوتوں اور کہانیوں میں تبدیلیاں کر کے اس طرح کے الفاظ یا فقرے ہٹائے گئے ہیں، جن سے کسی فرد یا طبقے کی دل آزاری ہوسکتی ہے، یا یہ ان کے لیے اہانت انگیز ہوسکتے ہیں۔اس کی ایک مثال بچوں کی ایک پرانی کھبت ہے۔جو آپ نے بھی ضرور سنی ہوگی۔ہوسکتا ہے خود بھی دوہرائی ہو:

کلو مٹلو بیٹا کہاں گئے تھے
بھنگن کے ٹوکرے میں سو رہے تھے
بھنگن نے لات ماری رو رہے تھے
بھنگی نے گڑ دیا ہنس رہے تھے

اب بھنگی۔بھنگن جیسے الفاظ قابل اعتراض قرار دیے جا چکے ہیں، بلکہ ان کا استعمال لائق سزا ہے۔کھبت کو یوں تبدیل کر دیا گیا ہے:

کلو مٹلو بیٹا کہاں گئے تھے
بیگنوں کے ٹوکرے میں سو رہے تھے
بیگن لڑھک گئے رو رہے تھے
اماں نے گڑ دیا ہنس رہے تھے

حتیٰ کہ انگریزی کی ایک نرسری رائم (چھوٹے بچوں کے لیے نظم) سے کالی جلد والے لوگوں کے لیے استعمال ہونے والا لفظ نگر (nigger) ہٹا دیا گیا ہے، کیوں کہ کافی عرصے سے اسے اہانت انگیز قرار دیا جا چکا ہے۔وہ نرسری رائم یوں تھی!

Eena Meena Mina Mo
Catch the nigger by the toe

اب ہوگیا ہے:

Catch the bad boy by the toe

تو یہ ایک عالمی سوچ ہے کہ بچوں کو عصبیت، جارحیت اور دوسروں کا دل دکھانے والے خیالات سے دور رکھا جائے۔

یوں تو یہ موضوع یعنی بچوں کا ادب بے انتہا وسیع ہے، لیکن چند باتیں بچوں کے لیے لکھنے والے حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔ان پر ہم اختصار سے یوں نظر ڈال سکتے ہیں:

☆ بچوں کے لیے لکھتے وقت ذہن میں یہ واضح رہے کہ کہانی کس عمر کے بچوں کے لیے لکھی جارہی ہے۔

☆ اس عمر کے بچوں کی دلچسپی، ذہنی سطح اور لفظیات کا خیال رکھا جائے۔

☆ جملوں میں الفاظ کی تعداد بھی اس عمر اور ذہنی سطح کے مطابق ہو۔یہ چھوٹے بچوں کے لیے پانچ سے نو الفاظ فی جملہ اور بڑے بچوں (۱۰ سے ۱۴-۱۳ سال) کے لیے بارہ سے چودہ الفاظ فی جملہ ہوسکتی ہے۔

☆ پانچ سے نو۔دس سال تک کے بچوں کو وہ کہانیاں بہت بھاتی ہیں جن میں الفاظ یا جملوں یا واقعات کی تکرار ہوتی ہے۔اس تکرار کی وجہ سے وہ انہیں ذہن نشین بھی خوب کر لیتے ہیں اور محظوظ بھی ہوتے ہیں۔مثلاً ایک گلہری کو روئی کا ٹکڑا مل جاتا ہے تو وہ اس سے اپنے کپڑے بنانا چاہتی ہے تو پہلے روئی دھننے والے کے پاس جاتی ہے ـــــ ٹک ـــــ ٹک جلدی دھن دے، بیاہ میں جاؤں، پلاؤ لاؤں، خود بھی کھاؤں تجھے بھی کھلاؤں۔روئی دھن جاتی ہے تو وہ سوت کاتنے والے کے پاس جاتی ہے ـــــ ٹک ٹک جلدی کات دے ـــــ بیاہ میں جاؤں ـــــ اس طرح وہ کپڑا بننے والے رنگنے والے سینے والے سب کے پاس جاتی ہے۔یہ کہانی انگریزی میں بھی ہے اور غالباً کسی یورپی زبان سے ہی ہندوستان پہنچی ہے۔بیشک یہاں روپ کچھ بدل گیا ہے۔انگریزی میں گلہری کا نام بھی ہے ـــــ سوزی۔

☆ اسلوب سادہ اور پرکشش ہونا چاہئے۔ (بقیہ ص ۳۷ پر)

انجینئر فیروز مظفر

Muzaffar Hanfi Memorial Society, D-40, Batla House, Muzaffar Hani Lane,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (Mob.9310365373)

مظفؔر حنفی: جدید غزل کا امام

مظفؔر حنفی بچپن ہی سے اچھی صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ حرکت وعمل سے عبارت رہا۔ بچپن سے لے کر آخری وقت تک ان کی زندگی کئی طرح کی ہنگامہ آرایوں سے مسلسل جدو جہد اور کاوشوں میں گزری ہے۔ انہوں نے اپنی متواتر کوششوں سے اپنی علمی استعداد اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ ان کے علمی، ادبی، تخلیقی اور تصنیفی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع اور ان کی شخصیت بہت عظیم ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوان کی تخلیقات میں بھی نظر آتے ہیں ان کی شخصیت کا سب سے روشن پہلوان کی انفرادیت پسندی ہے۔ بحیثیت شاگرد بھی ان کی سعادت مندی بے مثال ہے۔ وہ اپنے تمام اساتذہ کا ذکر بے حد ادب واحترام سے کرتے تھے۔

مظفؔر حنفی اردو کے ایک باکمال شاعر، محقق، ناقد، افسانہ نگار مترجم اور مرتب تھے۔ ان کی شخصیت ہشت پہلو صفات کی حامل ہے۔ ان کا تخلیقی سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا، لیکن بعد میں انہوں نے افسانہ نگاری ترک کر دی، صرف دس بارہ سال افسانہ نگاری کے میدان میں رہے، لیکن اتنے کم وقت میں انہوں نے ممتاز افسانہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی۔ ان کے تین افسانوی مجموعے۔ ''دوغنڈے''، ''دیدۂ حیراں'' اور ''اینٹ کا جواب'' بہت مقبول ہوئے تھے۔ ان کے افسانوں کی کلیات ''بھولی بسری کہانیاں'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ افسانہ نگاری چھوڑنے کے بعد انہوں نے شعر وشاعری سے اپنا رشتہ ایسا جوڑا کہ وہ مرتے دم تک قائم رہا۔ ان کی شاعری صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ اپنی ذات سے اجتماعی شعور کی سطح پر پہنچ گئی۔ شاعری میں غزل ان کی پہلی پسند رہی، لیکن انہوں نے نظمیں بھی خوب لکھیں، غزلوں اور نظموں کے علاوہ انہوں نے رباعیات، مراثی، قصیدے، حمد، نعت، سلام اور سہرے وغیرہ بھی لکھے جنہیں ناقدین ادب نے خوب سراہا۔

افسانہ نگاری اور شاعری کے بعد مظفؔر حنفی نے تحقیق وتنقید کی طرف رجوع کیا اور اس صف میں انہوں نے بلند وبالا مقام حاصل کیا۔ ادب اطفال پر انہوں نے خاص توجہ دی اور بچوں کی عمر اور ان کی ذہنی استعداد کے مطابق سادہ اور سلیس زبان میں بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے ۲۲ جلدوں میں این سی پی یو ایل کے لیے بہت اہم کام ''وضاحتی کتابیات'' (۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۹ء) تک تیار کی۔ بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے کئی کتابیں ترتیب دیں۔ اردو غزل کا آج تک سب سے بڑا اور اہم کام ''انجمن روح ادب'' الٰہ آباد کے لئے ''روح غزل'' کے نام سے ترتیب دیا۔ ''کلیات شاؔد عارفی''، ''کلیات ساغؔر نظامی'' جیسی اہم کتابیں ترتیب دیں، بہت سے تبصرے لکھے، خطوط نگاری میں اپنا مقام اور نام روشن کیا۔ کئی مونوگراف لکھے جن میں ''حسرؔت موہانی'' اور ''شاؔد عارفی'' بہت اہم ہیں۔ اپنا ایک ایسا سفر نامہ ''چل چنبیلی باغ میں'' بھی لکھا جسے قاری نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اردو شاعری میں جدیدیت کے رجحانات کا آغاز ۱۹۴۰ء کے آس پاس شروع ہو گیا تھا۔ جدید غزل کے آغاز کے بارے میں کوئی ایک رائے نہیں۔ کسی نے اس کا آغاز ۱۹۵۵ء سے تو کسی نے ۱۹۴۰ء اور کسی نے ۱۹۴۵ء سے بتایا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کا پودا ایک تناور درخت اور اردو شاعری کا ایک نمایاں اور ممتاز حصہ بن گیا تھا۔ مظفؔر حنفی کے شعری مجموعوں کے گوشوارے کے مطابق ۱۹۴۰ سے ۱۹۸۶ء تک تخلیق کی ہوئی غزلیں، جدید غزلیں ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ

مظفرؔ حنفی کی غزلوں میں طنزیہ اور جدید غزلوں کی درجہ بندی کرنا آسان نہیں ہے، کیوں کہ ان کی طنزیہ غزلوں میں اکثر جدید رنگ کے اشعار اور جدید غزلوں میں کہیں کہیں طنزیہ لہجے سے معمور اشعار دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے خود اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے اپنی آواز کو ابتدا ہی سے بھیڑ میں کھو جانے سے بچانے کی کوشش کی ہے اور ابتدا ہی سے شعوری طور پر اپنی مخصوص آواز، لہجے اور آہنگ کو برقرار رکھنے کا لحاظ رکھا ہے۔

راہ عام سے بچ کر شعر کہنے والوں میں
آپ کے مظفرؔ کا نام بھی ضروری ہے

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفرؔ کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

مظفرؔ حنفی نے جدید غزلیں تو لکھی ہیں، لیکن شعر وادب کی لازوال روایت سے حسب گنجائش وابستگی کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ کچھ ناقدین کا کہنا ہے کہ وہ غزل میں بہت سی باتیں بے تکلف برتتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مظفرؔ حنفی اینٹی غزل کے شاعر نہیں بلکہ غزل ہی کے شاعر رہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی بے باکی کو اظہار تضحیک و رنج کے بجائے اظہار برہمی کے لئے استحصال کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت انہیں انشاؔ سے زیادہ سوداؔ کے نزدیک لے جاتی ہے۔ مظفرؔ حنفی غزل کے ان اسالیب کو بھی آزادی سے برت لیتے ہیں جو نسبتاً زیادہ معروف اور قابل قبول ہیں، عشق اور زندگی کے وہ تجربات جنہیں انسان فرد واحد کی طرح جھیلتا ہے، سماجی یا انٹی ٹیو شنل انسان کی طرح نہیں وہ بھی مظفرؔ حنفی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔

مظفرؔ حنفی نے روایت اور بغاوت کے درمیان کی چیزوں کو اپنایا ہے۔ وہ ماضی کا احترام کرتے ہیں اور ہر اس روایت کو اپناتے ہیں، جو قابل قدر ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار بھی ان کی اپنی پہچان کے ساتھ الگ ہی نظر آتے ہیں۔ معاملات عشق میں لہجے کی شوخی اور بے ساختگی اور بے باکی، انداز گفتگو میں بے تکلفی اور احساس میں گرمی صاف دکھائی دیتی ہے، مظفرؔ حنفی کے اشعار جنہیں عشقیہ شاعری کی آبرو کہا جا سکتا ہے۔

اُگی ہے دوب یہاں بھی ترے بدن جیسی
کھلے ہیں پھول یہاں بھی ترے بدن کی طرح

کچھ ایسے انداز سے جھٹکا اس نے بالوں کو
میری آنکھوں میں در آیا پورا کجلی پن

پھینکا گیا ہے پھول جہاں سے رقیب پر
تشویش ہے وہ تیرا دریچہ نہ ہو کہیں

آج اک لڑکی نے میرا حافظہ مہکا دیا
رنگ ترے پیرہن جیسا تھا، بو تیری نہ تھی

بات ہی کچھ اور ہے اس کی کمر کے لوچ کی
نرم رو جھرنا ابھی کچھ اور بل کھائے ذرا

نیم غنودہ جسم ہے یا ہالے میں چاند
جھل مل تاروں میں پلکیں سی جھپکاتا ہے کون

مظفرؔ حنفی کی شاعری میں حسن و عشق اور زلف و رخسار کے علاوہ دیگر روایتی موضوعات پر بھی خوبصورت اشارے ملتے ہیں، جو ان کی استادانہ مہارت اور مشاقی کے مظہر ہیں۔ ان کی جدید غزلوں کی نمایاں خصوصیت جو

انہیں جدید ہم عصر شعرا کی بھیڑ بھاڑ میں سب سے زیادہ منفرد کرتی ہے، وہ ہے ان کا جداگانہ لہجہ، ظ انصاری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''بے باکی، بے تعلقی، بے لطفی کی حد تک والے طنز، گلی کے کھڑنجے پر کھڑاؤن پہن کر کھٹاپٹ چلنے کی آوازیں، شاد کی بازگشت سے نکل کر وہ یگانہ چنگیزی کے تیکھے لہجے، دلنواز ترنم اور اکھڑ غزل تک آئے۔ زندگی کے وسیع مشاہدے اور شدید سنگھرش نے اسے خاص زمانے کی کھردری حقیقتوں، روز مرہ کی ناہمواریوں اور بیان کی آڑی ترچھی لکیروں کا برتنا سکھلایا۔''

مظفر حنفی کی شاعری میں محض رومان آفرینی کے بجائے حقیقت بیانی کو زیادہ دخل ہے اور پھر لطف یہ بھی کہ ان کی تمام غزلیہ شاعری تغزل سے یکسر خالی بھی نہیں۔ ان کے کلام میں بے شمار ایسے اشعار ہیں جو لہجے کی شاعری کی اچھی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان اشعار میں احساس کی شدت اور جذبات کی ہنگامہ خیزی ایسی کیفیت پیدا کرتی ہے کہ پڑھنے والوں کے اندر ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ ابلنے لگتا ہے ؎

جتنے عرصے میں نیا تیر کماں تک جائے
چیختا ہے، مری آواز جہاں تک جائے

مظفر حنفی کو اپنے پیش رؤں اور ہم عصروں میں سب سے نمایاں کرنے والی بات ان کے قلم سے آج کی نسل کی تصویر کشی اور ان کا طنزیہ انداز تخاطب ہے، جس میں قنوطیت کی بجائے رجز کی شدت ہے، شکایت کے بجائے تمسخر ہے۔ مظفر حنفی کے اشعار سے موازنہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان اشعار میں باہم کوئی نہ کوئی وجہ مشابہت و مطابقت بھی موجود ہے۔

فسادات کے موضوع پر بھی مظفر حنفی کی غزلیں موجود ہیں ان کی ایک سوختہ غزل اس موضوع پر شائع ہوئی تھی، جس نے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ؎

پھر بسیں ٹولیوں میں جلا دی گئیں
دلہنیں ڈولیوں میں جلا دی گئی
نوجوانوں کے سر در پر کاٹے گئے
لڑکیاں کھولیوں میں جلادی گئیں

مظفر حنفی مذہب کو انسانی تاریخ کی ایک قدیم سچائی قرار دیتے ہیں، وہ مذہبی معاملات میں ریاکاری سے گریز کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ خدا کا وجود تمام کائنات میں جاری وساری ہے۔ سید اعجاز حسین کہتے ہیں کہ

''مظفر حنفی کے یہاں لہجے کی رمز شناسی بلاغت کو اس منزل پر پہنچا دیتی ہے جو دور جدید کے بہت کم شعرا کو نصیب ہوتی ہے۔ کوئی بات کہتے کہتے اس طرح چپ ہو جانا کہ ان کہی بات دل میں بیٹھ جائے جیسے شاعر نے کچھ کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا ہو۔''

عقائد کے موضوع پر مظفر حنفی کے یہ اہم شعار دیکھئے ؎

خوش فہمی کا نام عقیدہ، دھوکے کی دیوار یقین
بنیادی سچ بول مظفر ہر سچائی باطل ہے

دعا کبھی نہیں مانگی سو مانگ لیں اللہ
کہ درد ہو تو ہم آنسو بہا سکیں اللہ

جہاں کہیں روشنی ملی بانٹ لی مظفر
ہمارے دل میں کشاکش کفر و دیں نہیں ملتی

(بقیہ ص ۳۷ پر)

ڈاکٹر شہلا بانو
Ex. Head Dept. of Urdu, Rohtas Mahila College, Sasaram - 821115
(Mob. 880458364)

تقسیم ہند کے متنوع کرب اور چند افسانہ نگار

اردو افسانہ نہ صرف ادب کی مقبول صنف ہے، بلکہ اس نے اپنے عہد کی متنوع سیاسی، سماجی، معاشی تبدیلیوں اور تحریکات سے بھی اثرات قبول کیے ہیں۔ افسانے کی پر پیچ گھاٹیوں میں سید سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت، منشی پریم چند کی حقیقت پسندی، ''انگارے'' کے مصنّفین کے بغاوتی تیور، ترقی پسندوں کی سماجی حقیقت نگاری، آزادی کی جدوجہد کرنے والے، بھارت کی یکجہتی پر ایمان رکھنے والے، تقسیم کا درد جھیلنے والے تخلیق کاروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے یہاں اُن میں سے چند افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ذکر مقصود ہے جن کے افسانے تقسیم ملک کے لہولہان پس منظر میں سسکتی انسانیت کے لیے مداوائے الم بنے۔

آزادی کے ساتھ تقسیم وطن ہماری تاریخ کا انتہائی دردناک باب ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسی مثال شاید ہی ملے جہاں صدیوں کے رشتے ایک رات کی سحر کے ساتھ موت کی گہری نیند میں چلے گئے۔ سیاسی شعبدہ بازوں نے ملک تو تقسیم کر دیا، لیکن انسان کے مقدس رشتوں کو تقسیم نہ کر سکے۔ مہاجرت، فسادات، مشترکہ تہذیب، ماضی کی بازیافت، انسانی اقدار کی پامالی کو افسانوی ادب میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، راما نند ساگر، قرۃ العین حیدر وغیرہ کی تخلیقات المناک حقیقتوں کو پیش کرتے ہوئے انسان دوستی کا درس دیتی ہیں۔

کرشن چندر نے تقسیم کے المیہ اور فساد پر بہت سارے افسانے لکھے ہیں جو ''ہم وحشی ہیں'' کے نام سے ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے۔ یہ افسانے گرچہ جذباتیت اور وقتی جوش کی عکاسی کرتے ہیں پھر بھی محبت کے پیامی اور انسان دوستی کے خواہاں ہیں۔ اس مجموعے میں ''پشاور اکسپریس'' ایک اہم افسانہ ہے جس میں کرشن چندر نے ایک بے جان ٹرین کو قوت گویائی دے کر انسان کے ظلم و بربریت کی عکاسی کرتے ہوئے اسے زبردست طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک عرصے کے بعد وہ ٹرین پشاور سے بمبئی پہنچی ہے، لیکن قتل وغارت گری کے منظر کو وہ بھولی نہیں ہے۔ اس بے جان ٹرین کی ذہنی کیفیت کو مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے..... میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی۔'' (ہم وحشی ہیں، بمبئی ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۵)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذہبی جنون کی کیفیت سے دوچار ہو کر جب آدمی نے انسانیت کو پامال کیا اور جب وہ اپنے انسانی فرائض بھول بیٹھا، اس وقت انسانیت کا درس مصنف نے ایک بے زبان، بے جان ٹرین کے ذریعہ دیا جو انسان کی بے حسی اور درندگی پر طنز ہے۔

اسی طرح خواجہ احمد عباس کے مشہور افسانہ ''میری موت'' کے ابتدائی حصہ میں بھی تقسیم ہند کے بعد ایک نوجوان کی ذہنی کیفیت اور سیاسی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد قیامت صغریٰ برپا ہوئی جس کی لپیٹ میں سارا ہندوستان تھا۔ شیخ برہان الدین کا پڑوسی ایک مہاجر سکھ تھا۔ شیخ جی کا ذہن بھی تعصب کا شکار تھا۔ ان کی ذہنی کشمکش دیکھئے:

> ''میں نے سوچا واہ ری قسمت پڑوسی بھی ملا تو سکھ، حق ہمسائیگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔'' (بمبئی ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۶)

آخر میں شیخ جی کے تعصّبات سردار جی کی قربانی دیکھ کر خود ہی ختم ہو گئے۔ ہمدردی وندامت بھرے الفاظ میں وہ کہتے ہیں:

> ''سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟ میری زبان سے نہ جانے

یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا، خیالات، محسوسات، تعصّبات کی دنیا کھنڈر ہوگئی تھی۔''

(میں کون ہوں؟ ص ۱۸۳)

''میری موت'' میں ہلکی سی رمزیت اور ڈرامائیت کے پردے میں خواجہ احمد عباس نے جس فرقہ وارانہ اتحاد اور قومی یکجہتی کو پیش کیا ہے، یہ انہیں کا دوررس ذہن کرسکتا تھا۔ صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس کے ایک قریبی عزیز کو پیش آیا تھا جسے عباس نے افسانوی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہر مذہب وقوم میں نیک اور رحم دل اور خداترس لوگ ہوتے ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی مدد کرسکتے ہیں۔ عباس نے اس زمانے میں کئی ڈرامے ایسے لکھے جن کا مقصد امن وشانتی کی فضا پیدا کرنا اور اخوت ومحبت کے خیالات کو پھیلانا تھا جس کے گہرے مثبت اثرات بھی پڑے۔

سعادت حسن منٹو اردو کے افسانوی ادب میں بڑا ہی متنازعہ فیہ نام رہا۔ تقسیم ہند کے المیے نے تمام فن کاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہماری تہذیبی قدریں بکھریں، انسانیت شرمسار ہوئی، فسادات کا سیلاب لاشوں کا انبار چھوڑ گیا۔ تقسیم نے بے شمار مسائل پیدا کئے۔ ان میں پاگل خانے کے پاگلوں کا تبادلہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا مرکزی کردار بشن سنگھ سیاسی تقسیم کو قبول نہیں کرتا اور اپنی جان ایسی سرزمین پر دیتا ہے جہاں سرحد کی تقسیم نہ ہو:

''ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان، اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان، درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔''

منٹو نے اس افسانے میں تقسیم ملک اور تبادلۂ آبادی کے المیے کے اظہار کے لئے نفسیات کا سہارا لیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مختلف پاگلوں کی حرکات وسکنات اور گفتار سے تقسیم کے درد کا اظہار ہوا ہے۔ منٹو نے ملک کو تقسیم کرانے والوں کو شدید طنز کا نشانہ بنایا۔ ملک کی تقسیم اس حد تک غیر فطری ہے کہ پاگل خانے کے پاگلوں کو بھی یہ قبول نہیں ہے۔ اس افسانہ میں تاریخ، تہذیب اور نفسیات کے تناظر میں تقسیم کا المیہ نہایت ہی دردناک انداز میں بیان ہوا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے بجا لکھا ہے کہ:

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' تقسیم ہند کی ٹریجڈی کا ایک وژن ہے جس میں سعادت حسین منٹو کے رویہ، احساس اور لہجے نے ایک تاریخی حقیقت کو نفسی اور نفسیاتی احساس میں تبدیل کرکے ایک فنی نشان (Literary Sign) بنا دیا ہے اور یہ غیر معمولی کارنامہ ہے۔ افسانے کا غور سے مطالعہ کریں تو المیہ کی کمپوزیشن کی گہری ارتقائی صورت بڑی شدت سے محسوس ہوگی، ایک کردار کو اس طرح پیش کرنا کہ ہم خود اپنی ذات کی تلاش کرنے لگیں اور لفظوں اور جملوں میں اپنی ذات کا انکشاف ہونے لگے، معمولی کارنامہ نہیں۔'' (منٹو شناس، ص ۲۷)

بشن سنگھ جیسے پاگل نے دونوں ملکوں کے درمیانی حصے میں دم توڑ کر یہ ثابت کردیا کہ حب الوطنی کے جذبے پر سیاسی ہتھکنڈے حاوی نہیں ہوسکتے۔ منٹو نے اس سیاسی سانحہ پر ایک اہم کہانی ''سہائے'' بھی لکھا ہے۔ جس کے کرداروں کا تعلق دو مختلف مذہبوں سے ہے جو انسانی اقدار اور مذہب کی روح کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ''سہائے'' میں تخلیق کار کا جذبہ انسانیت دیکھئے:

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی کھاتے میں نہیں گئے..... مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہوسکتا ہے۔'' (کلیات، سعادت حسن منٹو، دوسری جلد، ترتیب شمس الحق عثمانی، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۲)

سہائے کی دنیا غلاظت سے معمور ہے، وہ طوائف کا دلال ہے۔ اس ذلیل پیشے کا ہونے کے باوجود سہائے کی روح پاکیزہ ہے۔ اس میں عصبیت بالکل نہیں ہے جبھی تو فسادات میں ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوکر بھی وہ مرتے مرتے ایک مسلمان طوائف کو اس کی امانت کے زیور واپس کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ منٹو نے سہائے، ممتاز اور جگل جیسے کرداروں کی تشکیل اس انسانی المیے کو سمجھنے کے لئے کیا ہے۔ ممتاز کو شروع میں سہائے کی انسان دوستی پر اعتماد نہیں تھا۔ وہ اسے جعل ساز کہتا ہے، لیکن مرتے وقت سہائے نے جو تاکید کی ہے اس سے ممتاز کی ذہنی سوچ تبدیل ہوگئی۔ وارث علوی نے منٹو کی اس کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے سہائے کے بارے میں لکھا ہے:

''ممتاز جب پاکستان کے لئے روانہ ہوتا ہے تو منٹو، سہائے کی روح کا حیات پرور لمس جگل سے اس کی شخصیت کی تمام جارحیت چھین لیتا ہے۔ وہ جس نے اپنے جگری دوست ممتاز سے کہا کہ اگر خطے میں فسادات ہوں تو شاید میں تمہیں مار ڈالوں، افسانہ کے آخر میں کہتا ہے، کاش میں سہائے کی روح ہوتا۔'' (اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتب پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی، ایڈیشن ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۹)

راجندر سنگھ بیدی کے یہاں بھی منٹو کی طرح افسانوی تخلیق میں سماجی اور نفسیاتی سیاق وسباق کی کارفرمائی ہے۔ تقسیم ہند کے المیہ پر نہ جانے کتنے ہی افسانہ نگاروں نے لکھا، لیکن اغوا شدہ عورتوں کے نازک مسئلہ پر جس فن کار نے قلم اٹھایا، وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ ان کی مشہور کہانی ''لاجونتی'' دراصل ایک مغویہ عورت کی کہانی ہے جس میں عورت و مرد کی نفسیات، باہمی رشتے کی نزاکت اور کش مکش کے ساتھ سماجی اصلاح کے مسائل ہمیں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

تقسیم کے خوں ریز منظر سے جنم لینے والی کہانی ''لاجونتی'' میں لاجو، سندر لال کی شریک حیات ہے جو مغویہ عورتوں کو ''دل میں بساؤ'' تحریک کے سرگرم ممبر بھی ہیں۔ ذاتی طور پر سندر لال کے باطن میں لاجو کی کمی نے ایک خلا پیدا کر دیا تھا جسے وہ ہر قیمت پر کرنا چاہتا تھا، ساتھ ہی ماضی کی بدسلوکیوں کا ازالہ بھی۔ قدرت مہربان تھی، وہ لاجو کو دوبارہ حاصل کر لیتا ہے، لیکن سندر لال کے رویے میں نرم و نازک اور غیر متوقع تبدیلی دیکھ کر لاجونتی (لاجو) نہ صرف نفسیاتی الجھن کا شکار ہوجاتی ہے بلکہ رفاقت کے بیچ ایک کھائی اس وقت اور حائل ہوجاتی ہے جب وہ اسے ''دیوی'' کہہ کر پکارتا ہے۔ درحقیقت وہ ''دیوی'' کہلانے کے لئے تیار نہ تھی، وہ پرشعور محبت کی طلب گار تھی۔ بیدی نے نفسیاتی کشمکش کی عکاسی اس طرح کی ہے:

''لاجونتی کی من کی من میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات ..... اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا..... آخر اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ وہ اور تو سب کچھ ہوسکتی ہے پر لاجو نہیں ہوسکتی۔ وہ بس گئی پر اجڑ گئی۔'' (اپنے دکھ مجھے دے دو، مطبوعہ نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، افسانہ ''لاجونتی''، ص ۲۴)

بیدی کی اس کہانی کا اختتام ''لاجونتی'' کی ذہنی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ باقر مہدی نے بجا لکھا ہے:

''یوں تو فسادات پر کہانیوں کا انبار ہے، لیکن بیدی کی یہ ایک کہانی ان سب سے الگ گہرا نفسیاتی تجربہ ہے۔ جذباتیت سے بچ کر اور نعرہ بازی سے ہٹ کر۔'' (بیدی: بھولا سے ببل تک، مقالہ باقر مہدی، مشمولہ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۵۵)

رام لعل اردو افسانوی ادب میں ایک معتبر نام ہے۔ تقسیم ہند کے المیہ کے درد و کرب کو انہوں نے بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ان کی کہانیاں ''نئی دھرتی پرانے گیت''، ''ایک شہری پاکستان کا'' وغیرہ تقسیم کے متنوع حالات و کیفیات کی آئینہ دار ہیں۔

''نئی دھرتی پرانے گیت'' سائیں داس اور ٹھاکر داس فیملی کی خلیج اور ان کی تہذیبی کشش پر مبنی ہے۔ یہ دونوں پڑوسی ترک وطن کا کرب بھی جھیل چکے ہیں۔ شادی کے موقع پر سائیں داس پرانے گیت کی صدا سن کر عجیب وغریب کشش سے دوچار ہوتا ہے اور پڑوس کی دیوار تک پہنچ کر گیت سنتا رہتا ہے جس سے اس کی روح کو تسکین ملتی ہے۔ ٹھاکر داس بھی اس کیفیت سے دوچار ہے۔ لوک گیتوں میں پنہاں تہذیبی کشش اور مقناطیسی کیفیت نے دونوں پڑوسیوں کی خلیجی دیوار کو پاٹ دیا یعنی دو دلوں کو جوڑنے کے لئے بہترین مرہم ثابت ہوئے۔

افسانہ ''ایک شہری پاکستان کا'' تقسیم کا ایک لاینحل مسئلہ لئے ہوئے ہے اور وہ ہے شادی شدہ جوڑوں کے الگاؤ کا درد و کرب۔ تقسیم میں نہ صرف ملک کا بٹوارہ ہوا بلکہ تہذیب وتمدن، جسم وجاں اور محبت کے جذبے بھی قربان ہوئے۔ برسہا برس کے بعد بھی اس افسانے کا کردار بلدیو اپنی دھرم پتنی سرسوتی کو فراموش نہیں کر پاتا۔ ایک طویل مدت کے بعد جب وہ ہندوستان آکر سرسوتی سے ملتا ہے تو وہ سندر داس کی شریک حیات بن چکی ہوتی ہے۔ بلدیو کے سسرالی رشتے دار بھی اس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ عدالت کا سہارا لینے کی بات کرتے ہیں۔ وہ عدالت کا سہارا نہیں لینا چاہتا بلکہ محبت کی عدالت میں آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سرسوتی کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

''جواب دو سرسوتی.....صرف تم سے پوچھتا ہوں.....
کمرے کے اندر ایک دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ سرسوتی زور زور سے رونے لگی۔ اسی وقت ایک شخص خاکی رنگ کا کاغذ لے کر اندر آیا اور کہنے لگا 'یہاں پاکستان کا ایک شہری آیا ہے اس گھر میں آکر ٹھہرا ہے نا' بلدیو نے اس کا کاغذ لوٹاتے ہوئے کہا 'ہاں آج لوٹ جائے گا' یہ کہہ کر اس نے اپنی اشکبار آنکھیں آستین سے پونچھیں.....اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔'' (رام لعل کے منتخب افسانے مطبوعہ سیمانت پرکاش، دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۷۲)

یہ ہے وہ نارسائی کی کرب ناک داستاں۔ سرسوتی کا چیخ کر رونا اور بلدیو کا اشکبار آنکھوں سے باہر قدم اُٹھانا نہ صرف قاری کو جھنجھوڑتا ہے بلکہ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو جاتی ہیں اور وہ تقسیم کو کوسنے لگتا ہے۔

کلام حیدری کے کئی افسانوں میں تقسیم کا المیہ نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ''کہانی سنو گے''، ''بازو کیوں کٹے'' اور ''کس کی کہانی'' قابل ذکر ہے۔ افسانہ ''کس کی کہانی'' بظاہر سادہ، لیکن بباطن بہت ہی پیچیدہ ہے جس میں مصنف نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے، جس میں واحد متکلم کا ذہن بار بار حال سے ماضی اور ماضی سے حال کی طرف سفر کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی قیامت خیزیوں سے بچ کر بھانجا اپنے ناآشنا ماموں کے یہاں پہلی بار ہندوستان آیا ہے۔ واحد متکلم اس کے وجود میں اپنے کئی پرانے رشتوں کو دیکھتا ہے، پھر اُسے اپنی باجی کی یاد آتی ہے جس میں بچپن کی شرارتیں ہیں، باجی کی دلجوئیاں ہیں، ماضی کی یادوں کی کسک محسوس کر کے بے قرار ہو کر اس نوجوان بھانجا سے لپٹ کر رونے لگتا ہے:

''تم میرے بیٹے ہو، میرے بھانجے ہو، میری باجی ہو، میرے دولہا بھائی ہو تم، اکیلے تم.....میرے بیٹے بھی ہو، میرے بھانجے بھی ہو، تم ماضی بھی ہو، تم حال بھی ہو، تم مستقبل بھی ہو۔'' (کہانی کے روپ، کلام حیدری، مرتبہ وہاب اشرفی، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۷۴ء، ص ۲۰۱)

اس افسانے میں واحد متکلم ''میں'' کی ہر آہ ماضی کی کسک اور محبت کی ترجمان ہے۔ ہندو پاک کی سرحد نے کتنے بھائیوں کو اپنی بہنوں سے جدا کر دیا۔ جب یہ درد ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو ''میں'' سرحد کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالتا ہے:

''سرحدوں کی بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے.....حد نظر تک لکیریں ہی لکیریں ہیں.....ہم تو ان لکیروں کے بیچ گم ہو گئے ہیں۔'' (کہانی کے روپ، ص ۱۹۹)

تقسیم ہند کی المناکی پر بہت سارے تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات پیش کیا ہے۔ افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، رامانند ساگر، انتظار حسین، اشفاق احمد، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، احمد ندیم

قاسمی، کلام حیدری، سید محمد اشرف وغیرہ کے کارنامے قابل قدر ہیں۔ ملک کی سلامتی کے لئے، بغض وعناد کو کم کرنے کے لئے آپسی اتحاد، ہمدردی اور انسانیت کے لئے مذکورہ افسانہ نگاروں نے بھرپور کوشش کی جس سے گم شدہ انسانی رشتوں کی بازیافت اور انسانیت کی آبیاری بھی ہوئی، محبت اور انسیت کے پیغام بھی ملے اور درد وکرب کو لفظوں اور قصوں کا ایسا جامہ بھی ملا، جو فکر وفن کے تار وپود سے بنا ہے اور ایسی ہنرمندی اور ایسے رنگ وروغن کے ساتھ بنا ہے کہ شاید وہ کبھی میلا اور فرسودہ نہ ہو سکے گا۔ ❁❁

مظفرؔ حنفی: جدید غزل کا امام (ص ۳۲ سے آگے)

گناہوں سے جھولی بھری تھی مری
خداوند محشر سے کیا مانگتا

مظفرؔ حنفی نے کربلا والوں کی شہادت پر اظہار تاسف اور ماتم کرنے کے بجائے اُسے ان کے مجاہدانہ ایثار اور بے مثال قربانیوں سے تعبیر کیا ہے۔ مظفرؔ حنفی نے داستان کربلا کو آج کے حالات سے مماثل قرار دیا ہے اور اپنے آپ کو حالات میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو کربلائے جانباز شہیدوں کا پیروکار کہا ہے ؎

کربلا مجھ کو بلاتی ہے مری راہ نہ روک
ہاتھ آئی ہے بگولے کی عنان جانے دے

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا ظلم کو پہچان جائے
خواہ اس کرب وبلا کے معرکے میں جان جائے

مظفر حنفی کی شاعری میں ہر قسم کے الفاظ کے ساتھ ان کا مساویانہ برتاؤ ہے۔ غزل کے وہ مروجہ الفاظ، تراکیب اور علائم جو استعمال کرتے کرتے گھس پٹ گئے تھے، مظفرؔ حنفی نے ان کے استعمال سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں دیہاتی فضا کی مہک جابجا محسوس کی جاسکتی ہے ؎

سوندھی سوندھی سی مہکار آنے لگی
ہل چلا تو زمین کھلکھلانے لگی

افسوس جدید غزل کا یہ امام ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۰ء کو اردو غزل کا ساتھ چھوڑ گیا۔

❁❁❁

بچوں کا ادب (ص ۲۹ سے آگے)

☆ براہ راست مخاطب کر کے اخلاقی و مذہبی درس نہ دیے جائیں۔ یہ متن میں پیوست ہونے چاہئیں۔

☆ کہانی کا موضوع بچوں میں خوف یا افسردگی پیدا کرنے والا نہیں ہونا چاہیے۔ ہو بھی تو اس کا ازالہ بھی جلد ہی ہو جانا چاہئے، جیسے ایک کہانی میں بھیڑیا، بکری کے بچوں کو کھا جاتا ہے، لیکن پھر بکری اس کے پیٹ سے برآمد کر لیتی ہے۔ وہ صحیح سالم اور خوش وخرم اپنی ماں کو مل جاتے ہیں۔

☆ بچے نو دس سال کی عمر تک جانوروں، پرندوں، بونوں، پریوں وغیرہ کی کہانیوں سے خوش ہوتے ہیں۔ انہیں بھی ان کے ادب میں شامل رکھنا چاہئے۔

بہرحال زندگی وسیع ہے اور موضوعات گوناگوں۔ یہ مصنف کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح موزوں ترین موضوعات کا انتخاب کر کے ان کی پیش کش کو بچوں کے لیے دلچسپ بنا کر سامنے رکھتا ہے۔ ❁❁

اردو شاعری پر عربی اور فارسی کا اثر

اردو شاعری میں ادب کی تخلیق عربی اور فارسی الفاظ کی سب سے زیادہ منت پذیر ہے۔ عہد عالمگیر میں جب اردو شاعری نے ترقی پائی تو سب سے پہلے فارسی شعرا نے اُدھر توجہ کی۔ موسوی خاں فطرتؔ، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، مرزا عبدالغنی وغیرہ فارسی کے مستند اور مشہور شعرا نے اردو میں شعر کہنے شروع کر دئے اور اس طرح فارسی ادب رفتہ رفتہ اردو کے قالب میں منتقل ہو گیا۔ اردو شعرا کو تجزیہ ادب کا خیال تو چوتھے ہی دور میں ہو چکا تھا، لیکن زبان پر صیقل فی الحقیقت چھٹے دور میں ہوئی۔ داغؔ دہلوی نے بامحاورہ سلیس اردو جس میں فارسی کے الفاظ بہت کم اور آسان تھے، اختیار کی اور فارسی الفاظ کا وہ شکوہ جو میرؔ کے زمانے سے اردو شاعری پر مسلسل مسلط تھا، کمزور ہوتا گیا۔ اگرچہ اردو شاعری کی خصوصیات ایہام وغیرہ میرؔ، سوداؔ، مظہرؔ اور قائمؔ نے ترک کر دی تھیں، لیکن تخیل کی پیچیدگی، ادق عربی اور فارسی الفاظ کا اشتراک، میر کے زمانے سے ناسخؔ وآتشؔ کے زمانے تک موجود تھا۔

(سیماب اکبر آبادی بحوالہ "شاعر" ج ۹۰، ش ۱۱)

ڈاکٹر محمد رضوان عالم
Mohalla Shah Jama, Chakniya Tola, Sasarm, Rohtas - 821115 (Mob. 6205590076)

لطف الرحمٰن کی غزلیہ شاعری کا انفراد

غزل کے تعلق سے عام خیال ہے کہ یہ صنف آسان ترین بھی ہے اور مشکل ترین بھی، آسان یوں اور ایسی کہ اس صنف میں اردو کے کم وبیش تمام تر شعرا نے خامہ فرسائی کی ہے اور مشکل ترین یوں اور ایسی کہ چند ہی شعرا اس صنف کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف ہے جہاں وضاحت سے زیادہ اشاریت سے کام لیا جاتا ہے۔ اس صنف کا محبوب ہونا یا اسے محبوب رکھنا سب کے بس کی بات نہیں، کیوں کہ اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے سخت محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غزل کا تقدس، اس کی پاکیزگی، لطافت و دلکشی اور نفاست، سلیقہ مندی قائم رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، البتہ جن کو یہ فن آجاتا ہے، وہ تلخ و شیریں فکر و احساس کو غزل کے پیراہن میں پیش کرنے کی صلاحیت کے مالک ہو جاتے ہیں، پروفیسر لطف الرحمٰن ایک معتبر اور منفرد ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کے ایک ایسے ہی باکمال شاعر گزرے ہیں۔

''تازگیٔ برگِ نوا'' (۱۹۷۷ء) لطف الرحمٰن کی غزلیہ شاعری کا پہلا مجموعہ اور ''بوسۂ نم'' (۲۰۰۷ء) دوسرا مجموعہ ہے۔ اگرچہ پورے تیس برسوں کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا، لیکن اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر مسلسل ریاضت فن میں مصروف رہا ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں نئی وادیوں میں پہنچ کر خوشنما اور دیدہ زیب پھول چن کر لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ فکر و احساس کی تازگی اور شعور و آگہی کی روشنی سے ''بوسۂ نم'' مملو ہے۔ ایک عرصے تک شاعری سے کنارہ کشی کے بعد جب لطف الرحمٰن ایک نئے عزم کے ساتھ نغمہ سرا ہوئے تو ہم راہی آگے بڑھ چکے تھے، کارواں ایک نئی بشارت دے رہا تھا۔ لطف الرحمٰن نے بڑے غور سے نقوشِ پا کا جائزہ لیا، راستے کے پیچ وخم کا مطالعہ کیا اور بڑی آسانی کے ساتھ اس طرح اپنے کارواں میں شامل ہو گئے کہ بچھڑ جانے یا سست روی کی کوئی علامت باقی نہ رہی۔

لطف الرحمٰن کے فنکارانہ مزاج کی پختگی اور استقامت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ان کی خاموشی، ان کی سخن پروازی اور ذوق نغمگی کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی بلکہ اس نے ان کے فکر و فن کو کچھ اور زیادہ روشن زیادہ دل نواز اور زیادہ پر تاثیر بنا دیا، چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

فریاد کو بھی ہم نے سلیقہ بنا دیا
آنکھوں کو جھیل جھیل کو دریا بنا دیا

ہوتا نہیں کوئی بھی کسی شخص کا اپنا
ہر لمس گزرتی ہوئی خوشبو کی طرح ہے

تھا مگر اتنا نہ تھا پیکر ترا روشن کبھی
تجھ سے پہلے کا زمانہ رائیگاں میرا بھی تھا

''تازگیٔ برگ نوا'' کو پروفیسر لطف الرحمٰن کے غزلیہ مجموعوں میں اوّلیت حاصل ہے، اس کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ اس دوسرے اڈیشن کو لطف الرحمٰن نے ''لطف الرحمٰن کے نام'' معنون کرتے ہوئے انتساب کے لئے نئی راہ نکالی ہے جس میں جدت ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی۔ دوسرے اڈیشن کے دیباچے میں لطف الرحمٰن نے لکھا ہے:

''میں عالمگیریت کی اس ہولناک سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور علمی و ادبی جارحیت کے عہد میں صرف غزل گوئی سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہ بے ضمیری کا عہد ہے، اجتماعی قتل انسانی کا دور ہے۔ بے کرداری موجودہ

اجتماعی زندگی کی پہچان ہے۔ان سارے مسائل کی ادبی تعبیر وتفسیر غزل کے ذریعہ ممکن تو ہے،لیکن یہ تہہ در تہہ رمزیت اور ایمائیت کی متقاضی ہے۔''

(''تازگیٔ برگ نوا'' دوسرا اڈیشن،۲۰۱۱ء،ص۱۱)

لطف الرحمٰن کی غزلیں عصری حسیت سے عبارت ہیں۔انہوں نے دنیا میں ہونے والی ناانصافی کو دیکھ کر ہمیشہ اپنے آپ کو مسلسل عذاب میں رکھا، جس کی وجہ سے ان کی غزلیہ شاعری میں دکھ کا احساس زیادہ نمایاں ہے ۔

سر جھکا کر چلنے والوں کا ہجوم بے پناہ
سر کٹا کر میں بھی گزرا ، امتحاں میرا بھی تھا

دشت غربت میں بھی آرام سے رہنے نہ دیا
سر بلندی نے کہیں چین سے جینے نہ دیا

جل بجھا وہ اپنے گھر کے ساتھ اپنی آگ میں
وہ لہو کا نوحہ گر اپنی اَنا میں قید تھا

یہ پرانے ہی سہی کھوٹے نہیں، مت پھینکئے
کل یہ سکے بھی کسی بازار میں چل جائیں گے

اب کسی سائے کا دھوکہ دشت میں مت کھایئے
اوڑھ کر اپنا ہی پیراہن ابھی سو جایئے

بلاشبہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنی شاعری میں اپنے دور کے کرب،الجھن اور تناؤ کو اپنے اندر اتار کر انہیں اپنے اشعار میں بڑی سلیقہ مندی سے پیش کیا ہے۔وہ مایوسی اور ناامیدی میں گھرے ہونے کے باوجود زندگی کی بے معنویت کے قائل نہیں ہو سکے بلکہ حالات سے نبرد آزما رہے۔

لطف الرحمٰن کی غزلیہ شاعری کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزلوں میں شروع ہی سے ایسا فنی رچاؤ ہے جسے کلاسیکیت سے ان کے تخلیقی مزاج کی قربت کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں ترقی پسندی کی آواز مدھم پڑ چکی تھی اور ان لہروں کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی جسے ادب کی تحریک میں جدیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس میں کیا شک کہ انہوں نے یہ آہٹ بہت قریب سے سن لی تھی ۔

یکسانیت کے بوجھ سے بھی تھک چکے تھے ہم
ٹوٹے جو شاخ سے تو بگولوں نے دی پناہ

پروفیسر لطف الرحمٰن کی غزلوں میں اگر ایک طرف وہ کلاسیکی لویں اپنی تابندگی کا احساس دلاتی ہیں جن میں گہرا تہذیبی وثقافتی شعور ہے تو دوسری طرف ان میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ روانی اور سبک خرامی کا احساس بھی ہوتا ہے۔دراصل شاعری نام ہے تمام تر فہم وادراک کے ساتھ زندگی کے مسائل کے بیان کا اور کہا جا سکتا ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لئے لطف الرحمٰن نے بڑی ریاضت کی ہے۔ڈاکٹر محمد نسیم نے غلط نہیں لکھا ہے کہ لطف الرحمٰن:''زندگی اور زندہ دلی'' کے شاعر ہیں۔انہوں نے شاعری کے متنوع اسالیب سے زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔لطف الرحمٰن کی شاعری کے تعلق سے شفیع جاوید رقم طراز ہیں کہ:

''لطف الرحمٰن نے اپنی تخلیقی کائنات کی ترتیب زندگی سے کی ہے۔ٹالسٹائی نے چیخوف کو 'Art of Life' کہا تھا۔لطف الرحمٰن کی تخلیقیت بھی اسی زمرے کی ہے کہ ان کے اشعار میں 'Script of Life' ہے۔'' (بحوالہ لطف الرحمٰن اپنی تخلیقات کے آئینے میں۔ڈاکٹر محمد نسیم،۲۰۱۳ء،ص۶)

پروفیسر لطف الرحمٰن کے اشعار میں غزلوں کے مثبت اقدار کی پاسداری ہے۔ساتھ ہی کلاسیکی شاعروں کی بازیافت کے ساتھ روشن مستقبل کے امکانات کی جھلک بھی۔وہ جدیدیت کے بھی نمائندہ شاعر ہیں،لیکن اس جدید شاعری میں بھی کہیں کوئی کھردراپن نہیں پایا جاتا اور نہ کسی قسم کی ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔یہی پروفیسر لطف الرحمٰن کے غزلیہ شاعری کا انفراد اور کمال ہے۔

❁❁❁

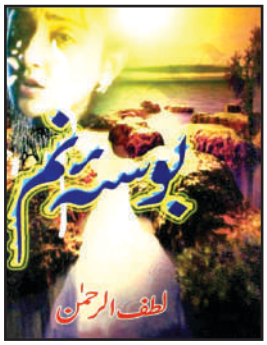

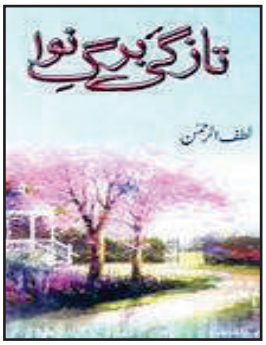

محمد فیصل خان
Research Scholar Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007 (Mob.9918998144)

بانگ درا کی نظموں میں عالمی شخصیات

شاعر کی حیثیت سے علامہ اقبالؔ کے مقام ومرتبے پر کوئی کلام نہیں، انھیں تو اردو شاعری کی تاریخ میں مفکر کا درجہ حاصل ہے، لیکن بحیثیت انسان بھی اقبالؔ کی ذات مختلف لوگوں کے اخلاق، کردار، گفتار اور کارناموں کی بنا پر ان سے متاثر تھی جن کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری میں جا بجا کیا ہے۔ ایسے اشخاص کی فہرست میں مذہبی راہنما، اہل علم حضرات، سیاست داں، قومی رہبر، جنگجو اور اسلامی مشاہیر وغیرہ کے نام دیکھے جاسکتے ہیں۔ اقبالؔ جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں بیداری کی مہم چلا رہے تھے، اسی طرح ان کے محبوب ترین اشخاص بھی زندگی کے الگ الگ شعبوں سے تعلق رکھنے والے مصلح وقت افراد ہیں، جن کو اقبالؔ نے اپنے کلام کے ذریعے خراجِ عقیدت وخراج تحسین پیش کیا ہے۔

آج سے ایک سوایک برس قبل علامہ اقبالؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''بانگ درا'' ۳؍ستمبر ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس میں موجود نظموں کی اہمیت اور معنویت روز افزوں ہے۔ ''بانگ درا'' اقبالؔ کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور یقیناً اس میں موجود نظموں کی شعری اٹھان بہت بلند ہے۔ اکثر نظموں میں فلسفے کا پرتو نظر آتا ہے۔ علامہ کی نظمیں چاہے، طبعزاد ہوں یا مترجمہ اور ماخوذ، بہرحال ان کی اپنی ایک الگ ہی شان ہے۔ ''بانگ درا'' میں بعض نظمیں مثلاً: ''مکڑا اور مکھی''، ''پہاڑ اور گلہری''، ''گائے اور بکری''، ''بچے کی دعا''، ''ماں کا خواب'' اور ''ہمدردی'' بچوں کے لئے بہترین تحفہ ہیں تو بڑوں کے لئے مختلف شخصیات پر انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں مثلاً: ''مرزا غالبؔ''، ''نالہ فراق''، ''بلال'' (اس عنوان کی دو نظمیں) ''داغؔ''، ''سوامی تیرتھ''، ''عبدالقادر کے نام''، ''رام''، ''فاطمہ بنت عبداللہ''، ''سرعبدالقادر''، ''(ابوبکر) صدیق''، ''نانک''، ''شیکسپیئر'' اور ''ہمایوں'' وغیرہ وہ بھی بہت اہم ہیں۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ ''بانگ درا'' کی وہ نظمیں جن میں تصویر کشی اور منظر نگاری ہے، مثلاً: ''گل رنگیں''، ''ابر کہسار''، ''آفتاب صبح''، ''چاند'' اور ''صبح کا ستارہ'' وغیرہ یا وہ نظمیں جن میں کوئی فلسفہ اور پیغام ہے، مثلاً ''طلوعِ اسلام''، ''شمع اور شاعر''، ''انسان اور بزم قدرت'' اور ''عقل ودل'' وغیرہ نظمیہ شاعری میں ''بانگ درا'' کے حوالے سے اقبالؔ کی عظمتوں پر گواہی دیتی ہیں۔ ان نوع بنوع نظموں میں سے یہاں فی الوقت ''بانگ درا'' کی انہیں نظموں پر حسب عنوان گفتگو مقصود ہے، جن میں عالمی شخصیات کو یاد کیا گیا ہے۔

بانگ درا میں جتنی بھی شخصی نظمیں شامل ہیں، اگر ان کا بغور مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح اقبالؔ کی وابستگی ان تمام اشخاص سے رہی ہے، پھر ان سے اقبالؔ کی ذہنی وفکری ہم آہنگی، ان کا جذباتی وقلبی لگاؤ یا مذہبی وروحانی نسبت اور علمی وعملی تعلق ثابت ہے، جس طرح الگ الگ فضا اور ماحول کے پروردہ اشخاص پر اقبالؔ نے نظمیں لکھی ہیں اس سے ان کی وسعت فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک یا پھر زمین وآسمان کے درمیان نظر نہ آنے والے افراد وشخصیات کا بھی اپنے کلام میں ذکر کیا ہے اور کوئی نہ کوئی ایسا جوہر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے جو انھیں سمجھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ انتخاب کے بعد جن شخصی نظموں کو زیر نظر مضمون میں جگہ دی گئی ہے وہ مختلف مذاہب اور شعبوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں مذہب اسلام کے لیے ابوبکر ''صدیق'' اور ''بلال''، ہندو مذہب کے لیے ''رام''، سکھ مذہب کے لیے ''نانک''، استاد کی اہمیت و معنویت کے لیے ''نالہ فراقؔ'' اور ''داغؔ''، اردو ادب کے لیے ''مرزا غالبؔ'' اور شبلی وحالی، مغربی ادب کے لیے ''شیکسپیئر'' اور نظریاتی مطابقت و دوستانہ مراسم کے لیے عبدالقادر کے نام اپنی اپنی جگہ اہم قرار پاتے ہیں۔

مذہبی اشخاص پر لکھی گئی نظموں میں ''صدیق'' کا عجب ہی

لطف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک کے موقع پر جب مال وزر کی اشد ضرورت آن پڑی تو سرورِ دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کو بلا کر خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ فرمانِ رسول سنتے ہی خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق (۵۷۳ء تا ۶۳۴ء) نے اپنے گھر کا سارا سامان حضور کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ جب آپ نے دریافت فرمایا کہ ابوبکر گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ تو اس عاشق رسول کا جواب تھا ''خدا اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں''صرف اسی ایک واقعے پر مبنی نظم ''صدیق'' کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اصل چیز جذبہ عشق ہے۔ رسول کی محبت میں سرشار صدیق اکبر کا یہ عمل تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ مثالی بھی ہے۔ آپ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کر جائیں، لیکن جاں نثاری کی ایسی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی احساس کو جس خوبصورتی سے علامہ اقبالؔ نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ نظم کے آخری شعر سے آپ بھی اس والہانہ عقیدت ومحبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں ؎

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

حضرت بلال (۵۸۱ء تا ۶۴۲ء) نے ابتدائے اسلام میں اللہ اور اس کے رسول کے لیے جو صعوبتیں برداشت کی ہیں اس کی نظیر نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے الگ الگ رنگ میں دو نظمیں لکھیں۔ ایک ''بانگ درا'' کے پہلے حصے میں ہے تو دوسری ''بانگ درا'' کے تیسرے حصے میں، لیکن دونوں ہی نظموں کا محور ''عشق رسول'' ہے۔ ان نظموں کے ذریعے اقبالؔ نے قوم کو جو پیغام دینے کی کوشش کی ہے وہ یہ کہ رسول سے سچے عشق نے ایک غلام کو کس طرح ابدی شہرت وبلندی عطا فرمادی اور ہمارے لیے اسے مثالی قرار دیا۔ ''بانگ درا'' کے پہلے حصے میں موجود نظم ''بلال'' سے یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

''بانگ درا'' کے تیسرے حصے میں شامل دوسری نظم ''بلال'' سے بھی ایک شعر سنتے چلیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ یورپ کے معروف فاتح سکندر رومی کو کس طرح بھلا دیا گیا اور ایک حبشی کو ربِّ کریم نے کیسی شہرت دوام بخش دیا ؎

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
رومی فنا ہوا، حبشی کو عمر دوام ہے

شری رام چندر جی ہندو مذہب میں ایک مقدس ہستی کا درجہ رکھتے ہیں۔ رام جی کی شخصیت صرف ہندو مذہب ہی میں عقیدے واحترام تک محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کسی نہ کسی طرح انھیں یاد کیا جاتا رہا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں بھی ان کا ذکر بڑے ہی پرکیف انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ولی دکنی، سراجؔ اورنگ آبادی،

میر تقی میرؔ، شاہ ترابؔ، برج نرائن چکبستؔ، شاذ تمکنتؔ اور علامہ اقبالؔ وغیرہ نے رام جی کو مختلف زاویوں سے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔

اقبالؔ اپنی نظم ''رام'' میں شری رام کو قدیم ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا بہترین نمونہ اور سرزمین ہند کے لیے باعث افتخار تصور کرتے ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک رام کے مقام و مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ انھیں نظم میں ''امام ہند'' کے لقب سے سرفراز کرتے ہیں۔ رام کی شخصیت کو سمجھنے کے بعد اگر نظم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبالؔ نے اپنے شاعرانہ کمال سے ''رام'' کی خوبیوں کو چند اشعار میں بڑی خوبصورتی سے ایک لڑی کے تحت پرو دیا ہے۔ اقبالؔ کا یہ عمل نہ صرف ہندوستان سے ان کی محبت اور وابستگی ثابت کرتا ہے بلکہ قومی یکجہتی، آپسی میل ملاپ اور ایک دوسرے کے احترام کا درس بھی دیتا ہے۔ یہ نظم اقبالؔ کی فراخ دلی، اعلیٰ اخلاق اور غیر متعصّبانہ رویے کے لیے ہمیشہ یاد کی جائے گی۔ اقبالؔ نے جس انداز سے ہندوستان کی اس عظیم المرتبت شخصیت کو اپنا خراج پیش کیا ہے اس کی جھلک ذیل کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے ؎

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

بابا گرونانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء) سکھ مذہب کے بانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے انسانوں کو آپسی محبت اور بھائی چارے کا درس دیا، اخوت پسندی کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کی اور خلوص و ہمدردی کے حامی رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ انھیں ''ہندو کا گرو، مسلمانوں کا پیر'' کہتے ہیں۔ گرونانک نے جن باتوں کی نصیحت کی ہے ان میں سے اکثر کی جڑیں اسلامی تعلیمات سے جاملتی ہیں۔ گرونانک نے ہندو اور مسلمان کے درمیان آپسی اتحاد و اتفاق کی جو فضا قائم کی تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ دونوں مذہب کے پروردہ اشخاص نے ان کی شان میں اپنے اپنے انداز سے نذرانے پیش کیے ہیں۔ اردو شاعری میں گرونانک کی مدح سرائی کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی، منور لکھنوی، جاوید وششٹ اور بسمل سعیدی جیسے بہت سے شاعروں نے نظمیں، غزلیں اور قطعات وغیرہ لکھے ہیں۔ نظیر نے تو اپنی نظم ''گرونانک جی کی مدح'' میں انھیں ''کامل رہبر'' کے خطاب سے نوازا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے بھی نظم ''نانک'' لکھ کر گرونانک کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے صدق دل سے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ معنوی اعتبار سے نظم دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ابتدائی حصے میں قوم کی ناقدری پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں ؎

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

جب کہ نظم اپنے دوسرے اور اختتامی حصے میں پوری بلندی پر نظر آتی ہے، جہاں اقبالؔ گرونانک کو ''مردِ کامل'' کے خطاب سے نوازتے ہیں اور اسلامی تاریخ کے اس واقعے کو تلمیح کے طور پر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح ایک بت پرست آذر کے گھر سے ابراہیم علیہ السلام کی شکل میں اسلام کی شمع روشن ہوئی اسی طرح پنجاب کی سرزمین سے ایک مردِ کامل اٹھا اور پورے ہندوستان میں اپنی تعلیمات کی روشنی پھیلا دی۔ نظم کے آخری دو شعر انھیں خیالات پر مبنی ہیں ؎

بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

''نالہ فراق'' ٹیپر وفیسر تھامس آرنلڈ کی یاد میں لکھی گئی نظم ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی پیدائش ۱۸۶۴ء میں ہوئی تھی۔ انھیں یونانی، لاطینی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، روسی اور ہسپانوی کے علاوہ عربی، فارسی اور سنسکرت زبان سے بھی واقفیت تھی۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۸۸ء کے درمیان پروفیسر آرنلڈ نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں درس و

تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۸۹۷ء میں یہ فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ یہیں انھوں نے اقبالؔ کو فلسفہ اور حکمت کی طرف راغب کیا اور اقبالؔ نے ان کی شاگردی میں فلسفہ کے مضمون میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۴ میں برطانیہ کے اندر ہندوستانی طلبہ کے مشیر مقرر کیے جانے پر پروفیسر آرنلڈ واپس انگلستان چلے گئے۔ ۲۱-۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک لندن یونی ورسٹی میں مشرقی علوم کے استاد کا عہدہ بھی سنبھالا۔ ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے برطانوی سرکار نے انھیں ۱۹۲۱ء میں ''سر'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ آرنلڈ کی وفات ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔

تھامس آرنلڈ برطانوی دور کے مسلمانوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سرسید کے علاوہ اس وقت کے کئی بڑے مسلم رہنما بھی ان کے اچھے دوست تھے۔ ۱۸۹۵ء میں انھوں نے اپنی شاہکار تصنیف ''Preaching of Islam'' لکھی۔ بیس سال کی طویل مدت میں لکھی گئی یہ کتاب اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اسلام دنیا میں تلوار کے زور پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں مثلاً اخلاق، کردار اور گفتار کی بدولت پھیلا ہے۔ جب سرسید کی نگاہ پروفیسر آرنلڈ کے اس شہرۂ آفاق کارنامے پر پڑی تو انھوں نے عنایت اللہ دہلوی سے اس کے ترجمے کی درخواست کی۔ اس طرح ۱۸۹۶ء میں یہ عظیم کارنامہ ''دعوتِ اسلام'' کے نام سے اردو میں بھی شائع ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ کا ایک اور تخلیقی جوہر ''میراث اسلام'' کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اسلامی تاریخ کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ''عبدالمجید سالک'' نے کیا ہے جو مجلس ترقی ادب لاہور سے اشاعت یافتہ ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے یورپ واپس لوٹ گئے تو اقبالؔ نے اپنے استاد کی یاد اور جدائی کے غم میں ''نالہ فراق'' کے عنوان سے نظم تحریر کی۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی یہ نظم پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ یوں تو پوری نظم میں اقبالؔ نے اپنے استاد کی جدائی کا نوحہ بیان کیا ہے، لیکن یہ نظم صرف استاد سے بچھڑنے کے شدید کرب کو ہی ظاہر نہیں کرتی بلکہ ایک سچے شاگرد کی اپنے استاد کے تئیں عقیدت و محبت، خلوص و ہمدردی، ان سے والہانہ تعلق اور عزت واحترام کی عمدہ مثال بھی قائم کرتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمت شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

اسی طرح اقبالؔ کے اندر حصولِ علم کی جو تشنگی باقی رہ گئی تھی اسے سیراب کرنے کے لیے جس لگن اور جستجو کا مظاہرہ انھوں نے اس نظم میں کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اس شعر سے آپ بھی اس کی تصدیق کریں گے کہ اقبالؔ علم کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو توڑ دینے اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے۔

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں بھی پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟

اقبالؔ کے قلم سے اپنے استادِ محترم کی شان میں لکھی نظموں میں دوسری منتخب نظم ''داغؔ'' ہے۔ ظاہر ہے کہ داغؔ دہلوی اقبالؔ کے استاد تھے اور یہ تو چنداں خاص بات نہیں کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے ادب واحترام اور مدح سرائی میں نظم تخلیق کرے، لیکن نظم کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے یہاں داغؔ کی جن جن خوبیوں کی طرف اشارے کیے ہیں وہ ہو بہو داغؔ کی شاعری کا خاصہ ہیں۔ انھیں خوبیوں کے تحت داغؔ نے اردو شاعری کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کیا۔ اقبالؔ نے داغؔ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے بانکپن اور وضع داری، شوخی اور بے باکی، دلکشی اور جاذبیت، جذبات نگاری اور وارداتِ عشق کی منظر کشی جیسے محاسن کا پتا دیا ہے۔ پوری نظم میں کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اقبالؔ نے مبالغے سے کام لیا ہو اور استاد کے حق میں محض قصیدہ خوانی کی ہو، بلکہ وہ ہر ایک بند میں داغ کے کلام کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے اردو کے محل سے ان کے رخصت ہو جانے پر مرثیہ خواں نظر آئے ہیں۔

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاک دلی! داغؔ کو روتا ہوں میں

اے جہان آباد! اے سرمایۂ بزم سخن!
ہوگیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گل رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

''مرزا غالبؔ'' بانگ درا کی پہلی شخصی نظم ہے جسے بعض ناقدین نے مرثیہ بھی کہا ہے۔ یہ نظم پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۰۱ء کے رسالہ ''مخزن'' میں شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں چند ترمیم واضافے کے ساتھ ''بانگ درا'' کا حصہ بنی۔ یہ نظم اردو کے مقبول ترین شاعر مرزا غالبؔ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) کو خراج پیش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے جو غالبؔ کے فنی کمالات کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کے غالبؔ سے حاصل کیے گئے معنوی رنگ وآہنگ کو بھی واضح کرتی ہے۔ نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں غالبؔ کی شاعری کا ضمنی طور پر جائزہ لیا گیا ہے جہاں اقبالؔ نے غالبؔ کے فکری ارتقا اور فنی بصیرت کی داد دی ہے، وہیں ان کے شعری آہنگ کو موسیقی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک طرف تحریر کی شوخی میں زندگی کا عکس تلاشا ہے تو دوسری طرف فکر وفن کی بلندی سے پیدا ہونے والے لطف کا پتا دیا ہے۔ مزید یہ کہ عظیم فارسی گو شعرا سے غالبؔ کی فارسی شاعری کا تقابل کیا ہے اور انھیں جرمن کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس گوئٹے کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس نظم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ہمیں جہان آباد (دہلی کا پرانا نام) کے درخشاں ماضی کی یاد دلاتی ہے اور ایک سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے اختتام کو پہنچتی ہے کہ یوں تو دہلی کی سرزمین میں لاکھوں موتی دفن ہیں، مگر کوئی ایسا بھی گوہر ہے جسے غالبؔ کے برابر قرار دیا جاتا ہو؟ اس استفہامیہ انداز نے بلاشبہ غالبؔ کی قدر ومنزلت کو نئی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے ؎

اے جہان آباد ! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بام و دَر
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس وقمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اردو کے نامور ادیبوں پر لکھی نظموں میں ''شبلی وحالیؔ'' کی اہمیت مسلم ہے۔ اقبالؔ کے لئے ان دونوں ادیبوں کی جدائی کا درد بھی انوکھا اور نرالا ہے۔ پہلے علامہ شبلیؔ نعمانی (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) اور پھر مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) کا ایک ہی سال میں یکے بعد دیگرے اس دارِ فانی سے رخصت ہوجانا صرف اردو ادب کے لیے بڑا خسارہ نہیں تھا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی بڑے صدمے کی بات تھی، کیوں کہ یہ دونوں حضرات جتنے بڑے ادیب وشاعر تھے، اتنے ہی بڑے مصلح اور قومی رہنما بھی تھے، لہٰذا اس ناقابل تلافی نقصان کا احساس جہاں اہل علم حضرات کو تھا، وہیں قوم کے ذی شعور اشخاص میں بھی بیقراری محسوس کی گئی۔ اقبالؔ نے اس درد وغم کو دوسروں کے مقابلے زیادہ حساس نظر سے دیکھا، ایسا اس لیے بھی ہوا کہ اقبالؔ سیاسی عوامل اور قوم کی میراث دونوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے، ساتھ ہی قوم کی اصلاح کا ذمہ بھی اپنے سر لے رکھا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں اقبالؔ نے اس سانحے سے پیدا ہونے والے خلا کو محسوس کیا اور اس کے نقصانات کو سامنے رکھ کر ''شبلی وحالی'' کے نام سے نظم لکھتی۔ اقبالؔ نے اس نظم کی بنیاد جس فکر پر رکھی تھی وہ یہ ہے کہ قوم کے ایسے افراد جن کے قلم میں طاقت تھی اور کلام میں تاثیر، ایک ایک کرکے اس دنیا کو خیرآباد کہتے جارہے ہیں۔ اب قوم کی اصلاح کون کرے گا؟ غفلت کی نیند سے انھیں بیدار کون کرے گا؟ قوم ابھی شبلی کی جدائی بھلا نہ سکی تھی کہ حالیؔ بھی داغ مفارقت دے گئے ؎

خاموش ہوگئے چمنستاں کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلیؔ کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالیؔ بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

شیکسپیئر (۱۵۶۴ء تا ۱۶۱۶ء) یورپ کا نامور شاعر اور ڈرامہ نویس تھا، جسے آج بھی دنیا بھر کے ممتاز ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؔ کی نظم ''شیکسپیئر'' اسی بلند پایہ دانشور کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبالؔ نے یہ نظم اس وقت تخلیق کی جب انگلستانیوں نے بین الاقوامی سطح پر شیکسپیئر کی شخصیت سے متعلق نظمیں لکھوانے کی تحریک کو عام کیا۔ بعدازاں اس ضمن میں لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ایک مخصوص کتاب کی

شکل میں شائع کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ نظم لکھتے وقت اقبالؔ کے ذہن میں یہ خیال گردش کر رہا ہو کہ اس نظم کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جائے گا جیسا کہ ''مطالب بانگ درا'' میں مولانا غلام رسول مہر اور ''شرح بانگ درا'' میں اسرار زیدی وغیرہ نے اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برخلاف نظر آتی ہے، اگر آپ اقبالؔ کی شخصی نظموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے کامیاب اشخاص پر نظمیں لکھ کر ان کی خوبیوں اور کارناموں کو اُجاگر کیا ہے تاکہ قوم وملت کا ہر فرد اس سے آشنا ہو سکے، پھر اس نظم کی بابت یہ کہنا کہ اقبالؔ کی نظر اس بات پر تھی کہ اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جانا ہے، مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

شیکسپیئر انسانی نفسیات کا بہت بڑا نباض تھا۔ اقبالؔ کی پوری نظم شیکسپیئر کی اسی خوبی کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کا کام کرتی ہے۔ سات اشعار کی یہ نظم دو بندوں پر مشتمل ہے۔ نظم کا تیسرا شعر دیکھیں ؎

حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

مذکورہ بالا شعر شیکسپیئر کے حسنِ کلام اور اندازِ بیان کی دل آویزی کو بیان کرتا ہے۔ اقبالؔ کے اس شعر کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ شیکسپیئر کا زیادہ تر کلام انسانی دلوں کی کیفیات کا غماز ہے اور دلی جذبات و احساسات کی خوبصورت مثالیں اس کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اس نے اپنے ڈراموں میں انسانی فطرت کی ہر ممکن تہوں کو مختلف طریقوں سے کھولا ہے۔ انسانی خوبیوں کا ایسا عمدہ اور دلکش نمونہ جو شیکسپیئر کے یہاں موجود ہے کسی اور کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

شیکسپیئر کے تخیل کی بلند پروازی کا یہ عالم ہے کہ اس نے زندگی کے بہت سے راز افشا کیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں اقبالؔ نے خورشید کو شیکسپیئر کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے کہ جس طرح آفتاب کو اس کی تمازت کے سبب کھلی آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا، مگر شعاعیں اس کی اصل حقیقت کو واضح کر دیتی ہیں، بالکل اسی طرح شیکسپیئر کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کے بجائے اس کے کارناموں پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی فکری وفنی بلندی کا کیا مقام ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دنیا کی بے شمار پوشیدہ حقیقتوں کو عیاں کیا ہے، مگر دنیا والے کما حقہٗ اس کی خوبیاں پہچاننے سے قاصر ہیں۔ ذیل میں دیئے گئے اشعار اس نکتہ کی طرف توجہ دلا رہے ہیں ؎

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تاب خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

بیسویں صدی کے اہم ترین علمی وادبی رسالہ ''مخزن'' کے بانی مدیر، ممتاز ادیب، بلند پایہ صحافی اور نامور قانون داں شیخ عبدالقادر ۱۵/مارچ ۱۸۷۴ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں نارمن کرسچن کالج لاہور سے بی۔اے کیا، انگریزی جریدہ ''پنجاب آبزرور'' میں بہ حیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر ملازمت شروع کی اور ترقی کرتے ہوئے ۱۸۹۸ء میں اس کے مدیر ہو گئے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں لاہور سے رسالہ ''مخزن'' کا اجرا کیا۔ یورپ سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء میں سرکاری وکیل ہو کر لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے اور یہیں ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے جج مقرر کیے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں بھاولپور کے چیف جج بنائے گئے اور ۱۹۴۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ قیام پاکستان کے تین سال بعد ۱۵/فروری ۱۹۵۰ء کو ان کی وفات ہوئی۔ ان کی دو کتابیں ''مقام خلافت'' اور ''ادبیات اردو کا احیائے جدید'' قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے قانون، ادب اور تعلیم تینوں ہی شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

اقبالؔ سے شیخ عبدالقادر کی پہلی ملاقات حکیم امین الدین کی قیام گاہ پر ہوئی اور پھر دوستانہ مراسم بڑھتے ہی چلے گئے۔ ''مخزن'' کے اجرا سے پہلے عبدالقادر نے اقبالؔ سے مشورے بھی کیے تھے اور رسالے کے لیے انھیں مسلسل نئی طرح کی نظمیں لکھنے پر آمادہ بھی کر لیا تھا۔

واضح رہے کہ اقبالؔ کی پہلی مطبوعہ نظم ''ہمالہ'' مخزن کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور اقبالؔ کے پہلے مجموعے ''بانگ درا'' پر مقدمہ بھی عبدالقادر کے قلم ہی کی مرہون منت ہے جسے فکر اقبالؔ کے

حوالے سے دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

شیخ عبدالقادر بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ۱۹۰۴ء میں جب انگلستان گئے تو وہاں سے اقبالؔ کو بھی لندن آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں اقبالؔ نے بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کا سفر کیا، حالانکہ وہ کیمبرج میں تھے اور عبدالقادر لندن میں، لیکن پھر بھی دونوں کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک جاری رہا۔ اسی درمیان جب اقبالؔ نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ عبدالقادر نے بھی اقبالؔ کو اس فیصلے سے باز رہنے کی تلقین کی، یہاں تک کہ اپنے استاد اور دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے شاعری سے قطع تعلق کا ارادہ ترک کر دیا۔

اقبالؔ نے اپنے اسی جگری دوست اور ادب کے محسن و مربی عبدالقادر کو گیارہ اشعار پر مشتمل ایک نظم بعنوان ''عبدالقادر کے نام'' لکھ کر ۱۹۰۸ء میں خط کے ذریعے بھیجی۔ اس نظم کے لکھنے کی سب سے بڑی وجہ اقبالؔ اور عبدالقادر کی ذہنی و فکری ہم آہنگی تھی۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں کے نظریات بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں، لہٰذا اقبالؔ نے اس نظم کے ذریعے عبدالقادر کو اپنے دلی ارادوں سے روشناس کرایا اور آگے چل کر یہی چیز نظم کی خوبی بھی ثابت ہوئی کہ قوم وملت کے افراد پر اقبالؔ کی زندگی کا مقصد واضح ہوگیا، جن خیالات کا اظہار اس نظم میں کیا گیا ہے اس کی تشریح وتوضیح ''خضر راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' جیسی نظموں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نظم کا ایک ایک شعر پیغام سے مملو ہے۔ اقبالؔ اپنے عزیز دوست عبدالقادر کے ساتھ مل کر قوم وملت کو پستی سے نکالنا چاہتے ہیں، اس کے لیے انھیں عشق حقیقی کی دعوت دیتے ہیں، قوم کے درخشاں ماضی کی یاد دلاتے ہیں، اسلامی تہذیب اور اقدار کی طرف راغب کرتے ہیں، دنیا کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں، انقلاب کے لیے سخت جدوجہد کی تلقین کرتے ہیں اور شمع کی مانند زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جو خود کو جلا کر دوسروں کی زندگی منور کر جاتی ہے ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کردیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں ، دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

الغرض: اقبالؔ کی شخصی نظموں میں بلا کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان منفرد اور دلچسپ ہے۔ اس طرح کی متعدد نظمیں ''بانگ درا'' کے علاوہ اقبالؔ کے دوسرے مجموعوں میں بھی مل جائیں گی جن کے مطالعے سے نہ صرف ہم ان اشخاص کے اوصاف حمیدہ سے باخبر ہوجاتے ہیں بلکہ ان کے کارناموں کی بنا پر ان کی اہمیت اور معنویت کی تصویر ہمارے دلوں میں نقش ہوجاتی ہے۔

اقبالؔ کی شخصی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کسی مخصوص قوم، مذہب، ذات پات اور رنگ ونسل کی ترجمانی نہیں کی بلکہ دنیا بھر سے مختلف النوع جہات میں کامیابی حاصل کرنے والے اہم ترین لوگوں کا انتخاب کر کے ان پر نظمیں لکھی ہیں، اس طرح وہ ساری دنیا کو اُن اشخاص کے کمالات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کی ذات کتنی خوبیوں کا سرچشمہ تھی۔ اقبالؔ یقیناً یہ امید رکھتے تھے کہ لوگ ان شخصیات کی پیروی کر کے خود میں تبدیلی پیدا کریں گے اور قوم وملت کو ترقی کی راہ پر لے جانے میں اہم کردار نبھائیں گے، لیکن افسوس کہ اب بھی ہم اس خیال سے کوسوں دور ہیں۔ آخر میں اقبالؔ ہی کی ایک نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' سے یہ دو شعر خراجِ عقیدت کے لیے اقبالؔ کی نذر کرتا ہوں ؎

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے ، فنا ہوتا نہیں
آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(''اقبالؔ: جہاں دوست'' پروفیسر عبدالحق، اقبالؔ اکیڈمی، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء، ''اقبالؔ: شاعر اور سیاست داں'' ڈاکٹر رفیق زکریا، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ''بانگ درا'' علامہ اقبالؔ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ایڈیشن، ۲۰۰۹ء ''ذکر اقبالؔ'' عبدالمجید سالک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۸ء اور ''کلام اقبالؔ کے اشخاص واصنام'' ڈاکٹر محمد نہال الدین، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۱ء سے مطالعاتی استفادہ کے ساتھ) ❁❁

یادیں

نثاراحمد صدیقی
Muslimabad, Near Gowardhan Maidan, Haspura - 824120
(Aurangabad) (Mob. 9546308801)

قیصرعثمانی: کچھ یادیں، کچھ باتیں

دس ماہ بعد جب میں اپنے شہراورنگ آباد (بہار) سے بمبئی واپس آیا تو یہاں ہر شئے بدلی بدلی سی نظر آئی۔ اندھیری اسٹیشن کا علاقہ ویران، ہرانسان سہاسہا، ڈراڈرا سا نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنی کھولی کے مالک اسمٰعیل صاحب سے وجہ دریافت کی توانہوں نے بتایا:

''یہاں دوگروپ بھائیوں (غنڈوں) کا ہے۔ یہ لوگ
جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو یہاں کے غریب عوام ہی
اس میں زیادہ پستے ہیں، آپ اشارہ سمجھ چکے ہوں گے؟''

میں خاموش نگاہوں سے اسمٰعیل صاحب کو دیکھ رہا تھا وہ سہمے سہمے سے نظر آرہے تھے۔ میں تھوڑی دیر بعد باتھ روم سے نکل کر اپنے روم میں آیا تو اس وقت اقبال خاں میرے کمرے میں موجود نظر آئے، وہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے کہا:

''آپ کب فلم سازمنیر خاں سے ملاقات کریں گے......؟ میں بھی ساتھ چلتا۔''

''ٹھیک ہے آج شام پانچ بجے ساتھ چلنا۔''

''ٹھیک ہے''

یہ کہہ کراقبال خاں رفو چکر ہوگئے۔ میں کپڑا زیب تن کر کے باہر نزدیکی ہوٹل میں جا پہنچا۔ چائے وائے سے شغل کر کے اندھیری ایسٹ کی جانب چلا گیا۔ چندلوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد اندھیری اسٹیشن کے ویسٹ چلا گیا تا کہ یہ دیکھ سکوں کہ ریلوے ٹکٹ کاؤنٹر کے پاس جو جوس شاپ تھی وہ کس پوزیشن میں ہے۔ اسٹیشن ویسٹ کی جانب چھوٹے چھوٹے ریڈی میڈ اور دیگر چیزوں کے ڈالے لگتے تھے، چندکو چھوڑ کر، کوئی نظر نہیں آیا۔ جوس شاپ پہنچنے کے بعد راجندر (جوس شاپ کے مالک) نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور انگور کا جوس پیش کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا:

''آج کل فلم انڈسٹری میں اسٹرگل کرنے والے بہت کم لوگ یہاں آرہے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیوں؟'' راجندر نے دبی زبان میں جواب دیا: ''حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے ہیں، لیکن اب تیزی کے ساتھ حالات معمول پر آرہے ہیں۔'' میں جوس پی کر گلاس کے ساتھ پیسے دینے لگا تو راجندر نے پیسے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

''آج نہیں، کل سے پیسے لوں گا۔''

میں خاموشی سے جوس شاپ سے نکل کر راج بس اسٹاپ کی جانب چلا گیا۔ چند گھنٹے چہل قدمی کے بعد موگراپاڑہ کے ایک ہوٹل میں گیا اور دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے روم میں چلا آیا۔ تقریباً دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد اقبال خاں کو لے کر فلم ساز نواب منیر خاں سے ملنے کے لئے ان کے آفس کی جانب چل پڑا۔ راستے میں ''فلمالیہ اسٹوڈیو'' تھا، اس کے اندر چلا گیا۔ وہاں کوئی جان پہچان کے لوگ نظر نہیں آئے۔ پتہ کرنے پر ظاہر ہوا کہ آج سات ماہ سے کوئی بھی فلم کی شوٹنگ اس اسٹوڈیو میں نہیں ہوئی ہے۔ میں وہاں سے نکل پڑا اور فلم ساز منیر خاں کے آفس جا پہنچا۔ آفس لاک تھا۔ وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ آفس کے بازو والے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ:

''تقریباً آٹھ نو ماہ سے یہ آفس بند ہے۔''

میں نے اسی وقت فلم ساز اسرار انصاری کو فون کیا۔

''بھئی اسرار صاحب منیر خاں صاحب کا آفس بند ہے ان کے بازو والے نے بتایا کہ آٹھ نو ماہ سے یہ آفس بند ہے۔ وجہ کیا ہے؟''

اسرار انصاری نے جواب میں بتایا: ''ہاں بھائی، پتہ نہیں وہ

کہاں غائب ہوگئے۔ میں ان کی کوٹھی تک گیا وہاں بھی وہ نہیں ملے۔ ان کا موبائل بھی بند بند بتا رہا ہے۔ چند ماہ قبل جو افراتفری ہوئی تھی اس میں بہت سارے ملنے والے غائب ہیں، کیا بتایا جائے۔ اللہ انہیں خیر وخوبی سے رکھے۔''

میں گھبرا گیا اور وہاں سے سیدھا اندھیری اسٹیشن چلا آیا۔ جوس شاپ میں شہزاد خاں نظر آئے۔ انہوں نے ہمیں ایک گلاس انار جوس پیش کرتے ہوئے کہا:

''نوش کیجئے.....''

میں نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:

''بھئی فلم ساز نواب منیر خاں کا کوئی پتہ نہیں، وہ کہاں غائب ہوگئے؟ ان کے دوستوں کو بھی معلوم نہیں۔ ان کے دوستوں سے معلوم ہوا کہ وہ افراتفری کے زمانے سے ہی غائب ہیں۔''

معاون اداکار شہزاد خاں نے کہا: ''اللہ سے دعا کیجئے وہ جہاں بھی ہوں بخیر وخوبی ہوں۔'' اس کے بعد ہم تینوں وہاں سے اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔

چند دنوں بعد میں نے اپنے معاون کے دوست پریم کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آٹھ نو ماہ سے غائب ہیں۔ یہ سن کر فکر لاحق ہوئی اور سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ اسمٰعیل صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے بتایا:

''آپ کے سالے صاحب دو تین ماہ قبل آئے تھے، آپ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ آپ جا کر ان سے ملاقات کرلیں۔''

میں اسی وقت قاسم نگر کے لئے نکل پڑا، وہاں معلوم ہوا کہ ''جمن خاں کے سبھی لوگ انڈر گراؤنڈ ہیں، پتہ نہیں وہ لوگ کہاں ہیں؟'' میں خراماں خراماں واپس موگرا پاڑہ آگیا۔ شام کے وقت اسمٰعیل صاحب کو اپنے سالے اور ان کے گروپ سے متعلق مکمل جانکاری دی تو وہ خاموش رہے اور تھوڑی دیر بعد گویا ہوئے: ''شاید آپ کے کوئی گاؤں والے ''گوئل پروڈکشن'' سے منسلک ہیں ان سے ملاقات کرکے ان کی خیریت لے لیں تو بہتر ہوتا۔ وہ کیسے اور کس عالم میں ہیں، واللہ اعلم؟''

میں نے ہنکاری بھرتے ہوئے کہا:

''کل انشاء اللہ گیارہ بجے دن میں ان سے ملاقات کرنے ملاڈ (ایسٹ) جاؤں گا۔''

دوسرے دن تقریباً گیارہ بجے ملاڈ چلا گیا۔ اسٹیشن سے میں پیدل ہی پشپا پارک کی جانب چل پڑا۔ جب پشپا پارک پہنچا تو اس جگہ کئی بلڈنگیں مختلف نام سے آباد تھیں۔ تلاش کرتے ہوئے ''جمیلہ بلڈنگ'' پہنچا اور ان کے دروازے پر لگے ہوئے بیل (گھنٹی) دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص نمودار ہوا، جو نیم پاگل جیسا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا:

''کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے قیصر عثمانی صاحب سے ملنا ہے، وہ میرے شہر کے قریب پیر بیگہ گاؤں کے رہنے والے ہیں، ویسے ان سے سرسری ملاقات سال بھر قبل ''ہمالیہ اسٹوڈیو'' میں ہو چکی ہے۔''

ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ قیصر عثمانی صاحب اندر سے آگئے اور مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ خیر وعافیت پوچھنے کے بعد انہوں نے دس ماہ قبل جو ممبئی میں کانڈ ہوا تھا وہ ہم دونوں کے درمیان موضوع بحث بنا رہا، پھر میں نے اپنے متعلق، فلم انڈسٹری میں کیسے اور کیوں کر آیا، اپنی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے مکمل روداد سنائی، پھر انہوں نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ ''میں تلاشِ معاش کے لئے ۱۹۴۲ء کے اوائل میں کلکتہ پہنچا۔ شیدا کیوروی جو میرا دوست تھا وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ شیدا کیوروی نے ایک فلم ''پردہ نشیں'' میں ہیرو کا بھی کردار ادا کیا تھا۔ اس نے مجھے فضلی برادران سے ملوایا اور اس کے ذریعے مجھے فضلی برادران نے پچاس روپے پر ملازم رکھ لیا۔ اُس زمانے میں دلیپ کمار، راج کپور، دیوانند، نرگس، ثریا، مدھوبالا یہ سب ممبئی فلم انڈسٹری میں اپنا جلوہ دکھا رہے تھے۔ میرے جوائن کرنے کے کچھ ماہ بعد فضلی برادران نے ایک فلم ''یادگار مشاعرہ'' بنانے کا اعلان کیا۔ اس فلم کی کہانی سید فضل احمد کریم فضلی نے لکھی تھی جو اپنے زمانے کے مشہور و معروف کہانی کار تھے۔

قیصر عثمانی

فضل احمد کریم فضلی اُس وقت کلکتہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدہ پر براجمان تھے۔ مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، ساغرؔ نظامی، بسملؔ الٰہ آبادی، مسعود علی ذوقؔ اور کئی دوسرے معماران ادب اس فلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہے تھے۔ ایک دن اچانک آفس میں آگ لگ گئی اور اس فلم کے سارے پرنٹ جل کر راکھ ہوگئے۔ اگر یہ فلم بن جاتی تو یقیناً ایک یادگار فلم ہوتی۔ تقسیم ہند کے بعد فضل احمد کریم فضلی پاکستان چلے گئے، لیکن ان کے چھوٹے بھائی ایس۔ فضلی نے ہندوستان میں رہ کر کئی فلمیں بنا کر شہرت حاصل کی۔ ان ہی کی ایک فلم ''چورنگی'' تھی جس میں میں نے بھی ایک چھوٹا سا رول ادا کیا تھا۔ یہ رول ایس فضلی کے اصرار پر ہی کیا تھا کیوں کہ مجھے ایکٹنگ کا کوئی خاص تجربہ تھا نہیں اور نہ ہی مجھے اداکاری سے کبھی کوئی دلچسپی رہی۔

ایس فضلی مجھے کبھی بھی نام سے مخاطب نہیں کرتے، وہ مجھے برابر ''پرنس چارمنگ'' کہتے تھے۔ چند سال بعد فضلی برادران لمیٹڈ کلکتہ سے ممبئی منتقل ہوگئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ممبئی چلا آیا اور ان کے شامل کام کرتا رہا، پھر کئی برسوں بعد ''گوئل پروڈکشن'' سے منسلک ہوگیا۔ میں گوئل پروڈکشن کے سارے اسٹاف کا ہر دل عزیز رہا۔ گوئل صاحب بھی مجھے دل و جان سے چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آج تک اس پروڈکشن سے منسلک ہوں۔''

یہ جملہ مکمل ہونے کے وقت ہی قیصر عثمانی کے ایک صاحبزادے چائے ناشتہ لے کر آگئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

''کیا آپ بھی فلم انڈسٹری سے منسلک ہیں؟''

میں نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں مکمل طور پر تو نہیں ہوں، لیکن.....'' اسی وقت قیصر عثمانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر جانے کے لئے کہا، پھر ہم دونوں ناشتہ چائے سے شغل کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے بڑے بھائی عبدالقیوم عثمانی صاحب کی جو پرانی کریم گنج گیا میں مستقل رہائش پذیر تھے، خیریت دریافت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ:

''بھئی، قیوم صاحب تو باضابطہ شاعر ہیں۔''

قیصر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

''میں انہیں بچپن سے جانتا ہوں وہ شاعر بھی ہیں، شاعر گر بھی۔''

''جی ہاں، انہوں نے کئی رسالوں میں اپنی شعری تخلیقات قیوم اثر کے نام سے شائع کرائی ہیں۔ جب میں ماہنامہ ''آہنگ'' و ہفتہ وار ''مورچہ'' سے وابستہ تھا تو ان کی کئی غزلیں ان دونوں رسالوں میں شائع کی ہیں۔ ہاں، قیصر صاحب! میں ایک نکتہ کی بات بتانا بھول گیا، وہ یہ کہ قیوم اثر کے دونوں صاحبزادے نجم عثمانی اور سرور عثمانی ادبی دنیا میں آج کل دھوم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اردو ادب میں اپنا مقام چند سالوں میں یقیناً بنالیں گے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ سرور عثمانی نے ''مفاہیم'' نام سے ایک ضخیم رسالہ بھی جاری کیا ہے، جو ادبی دنیا میں چرچا کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس کی ادارت میں فرحتؔ قادری، افصح ظفر وغیرہ شامل ہیں۔''

قیصر عثمانی نے ٹیبل کی دراز سے ''مفاہیم'' کے تین شمارے نکال کر ٹیبل پر رکھ دیئے: ''یہ لیجئے.....!'' میں ان شماروں کو دیکھ نہیں پایا تھا، کیونکہ اس زمانے میں تلاش معاش کے چکر میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ سرسری طور پر ان تینوں شماروں کی ورق گردانی کر کے ٹیبل پر چھوڑ دیا۔ قیصر عثمانی نے مجھ سے سوال کیا:

''آپ آج کل کس پروڈکشن سے منسلک ہیں؟''

''دو دن قبل ہی گاؤں سے آیا ہوں۔ اس کے قبل فلم ساز و ہدایت کار نواب منیر خاں کے لئے کام کر رہا تھا۔ وہ میرے تحریر کردہ ڈراما ''شعلے بھڑک اٹھے'' پر کام کر رہے تھے۔ کاغذی تیاری بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی اور اس کہانی پر سائننگ اماؤنٹ بھی مجھے دستیاب ہو چکے تھے، لیکن میں جب دس ماہ بعد گاؤں سے واپس آیا ہوں تو کئی لوگ ممبئی سے غائب نظر آئے جن میں فلم ساز منیر خاں اور میرا معاون بھی شامل ہیں۔ منیر خاں کے عزیز ترین دوست فلم ساز اسرار انصاری سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی کئی ماہ سے ان کی تلاش کر رہے ہیں، لیکن کچھ پتہ.....''

ابھی جملہ مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ قیصر عثمانی نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''آپ کو غائب ہونے والوں کی خبر لینے کی ضرورت نہیں ہے، آپ اپنے کام سے کام رکھئے اور اخبارات میں پہلے جس طرح کام کر رہے تھے اسی طرح کرتے رہئے۔''

اس درمیان قیصر عثمانی صاحب کا نیم پاگل لڑکا حاضر ہوا اور

مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا: ''آپ مجھے دیکھ رہے ہیں؟ کیا میں دلیپ کمار کے جیسا نہیں لگ رہا ہوں.....؟ میں ان سے بہتر اداکاری کرسکتا ہوں، لیکن ابی مجھ پر کوئی دھیان نہیں دے رہے ہیں۔''

قیصر عثمانی غصے کی حالت میں اسے پکڑ کر اندر لے گئے۔ میں نے قیصر عثمانی صاحب سے پوچھا:

''کیا اسے.....؟''

انہوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ''وہ پاگل ہو چکا ہے۔ بہت سارے ڈاکٹروں سے علاج کرایا، لیکن کوئی افاقہ نہیں ہے۔ یہ ہر وقت قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوکر اپنی زلف، جسم، ہاتھ پیر کے ذریعے اداکاری کرتا رہتا ہے۔ میں عاجز آچکا ہوں، کیا کروں؟''

میں تسلی بخش باتوں سے ان کا ذہن بدلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسی وقت ان کے دوسرے صاحبزادے نے کہا:

''کھانا ڈسک پر لگادیا گیا ہے۔''

ہم دونوں اس جگہ سے اُٹھ کر یکے بعد دیگرے باتھ روم گئے اور پھر ہاتھ منھ دھوکر کھانے کی میز پر آبیٹھے۔ آدھے گھنٹے بعد کھانے سے فراغت پاکر پھر باہر والے روم میں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پھر مختلف موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ اسی گفتگو کے دوران قیصر صاحب نے دو تین بڑے اخبارات کے مالک وایڈیٹر کے نام خطوط دیئے اور کہا:

''آپ کوئی بھی ایک اخبار میں پارٹ ٹائم کام کیجئے، لیکن یہ یاد رہے کہ پہلے جن اخباروں میں کام کر رہے تھے انہیں ہرگز نہ چھوڑیں۔''

یہ سارے خطوط ''ادبی سنگم'' کے لیٹر پیڈ پر تحریر کئے گئے تھے۔ میں نے ''ادبی سنگم'' سے متعلق دریافت کیا:

''قیصر صاحب! یہ ادارہ آپ نے کب قائم کیا؟''

''یہ ادبی ادارہ ۱۹۷۰ء میں مجروحؔ سلطان پوری، سردار جعفری، اسدؔ بھوپالی، حسرتؔ جے پوری، شیلندر، قمر جلالؔ آبادی اور کئی دوسرے لوگوں کے تعاون سے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کے تحت ہندی، اردو کے کئی بڑے سمینار، مشاعرے وکوی سمیلن ہو چکے ہیں، جن کی رپورٹیں ہندوستان کے مختلف اردو، ہندی، انگریزی، مراٹھی، گجراتی اخبارات میں شائع ہوئی ہیں، یہ ادارہ آج بھی فعال ہے۔''

''کیا آپ کی شائع شدہ تصنیفیں بھی ہیں؟''

انہوں نے جواب میں کہا:

''فلمستان' (مضامین) 'اور طوفان تھم گیا' (ناولٹ) 'پرچھائیوں کا دیس' (طویل نظم) 'حدیث دل' (شعری مجموعہ) 'یادوں کا سفر' (خاکے) اور چند دوسری کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ میں آپ کو چند کتابیں برائے مطالعہ دے رہا ہوں، انہیں پڑھیں اور اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیں۔'' یہ کہہ کر اندر گئے اور چند کتابیں لاکر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں ان کتابوں کا سرسری طور پر ورق گردانی کرتے ہوئے ایک تھیلے میں رکھ کر تھوڑی دیر بعد اندھیری چلا آیا۔

اندھیری اسٹیشن سے موگرا پاڑہ خراماں خراماں اپنے روم میں پہنچا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب میں اپنے پلنگ پر آیا تو سوچنے لگا کہ قیصر عثمانی صاحب خلوص ومحبت کا ایک پیکر ہیں۔ وقت وحالات نے انہیں جسمانی و معاشی طور پر کافی کمزور کردیا ہے، لیکن دل ان کا کافی وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''گوئل پروڈکشن'' والے انہیں کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے، کیوں کہ کسی فلم یا کسی دوسرے اہم مسئلہ پر ان کا مشورہ مشعل راہ ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر گوئل صاحب ان کے گھر کا خرچ اب تک اٹھا رہے ہیں۔

میں قیصر صاحب کے یہاں آئے دن جاتا رہا، وقت و حالات کے تحت فون پر بھی برابر رابطہ رہا، لیکن روز بروز میری مشغولیت بڑھتی گئی اس لئے نو دس ماہ تک ان کے حالات سے بے خبر رہا۔ دلیپ کمار (یوسف خاں) کی کوٹھی (۳۲ پالی ہل، باندرہ، ممبئی) کا ایک کمرہ دیپک کنول (دلیپ کمار صاحب کے آفس سکریٹری) اور فلم رائٹرس۔ایل، کاوش کے منجھلے صاحبزادہ انیل کاوش کی وجہ سے آفس کے لئے دلیپ صاحب نے مجھے دے دیا تھا، جس کی وجہ سے قیصر عثمانی صاحب سے دوریاں بڑھتی گئیں۔ اسی درمیان پروفیسر مناظر احسن کا اورنگ آباد، بہار سے ایک دن اچانک فون آیا کہ ''ظفر اوگانوی انتقال کرگئے۔'' یہ سن کر دل کو دھچکا لگا کیوں کہ ظفر اوگانوی میرے قریبی دوستوں میں سے ایک ذہین دوست تھے۔ میں نے اسی وقت دیپک کنول اور انیل کاوش کو

(بقیہ ص ۵۶ پر)

سلطان آزاد
Pannu Lane, Gulzarbagh, Patna -800007 (Mob.8789934730)

ش۔م۔عارف ماہرؔ آروی: کچھ یادیں، کچھ باتیں

ش۔م۔عارف ماہرؔ آروی ایک محقق، ناقد اور ایک شاعر کی حیثیت سے تعارف کے دست نگر نہیں۔ش۔م۔عارف یعنی شیخ محمد عارف ابن شیخ محمد مسلم مرحوم کی پیدائش سند کے اعتبار سے ۱۰؍اکتوبر ۱۹۳۰ء بمقام برہ بترہ، آرہ ہوئی۔علمی لیاقت بی۔اے (آنرس) کے علاوہ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل ہے۔تعلیم سے فارغ ہوکر ۹؍ستمبر ۱۹۵۵ء کو پٹنہ ہائی کورٹ میں اسسٹنٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ترقی پاکر ۳۱؍اکتوبر ۱۹۸۸ء تک سیکشن آفیسر کے عہدہ پر رہتے ہوئے سبکدوش ہوگئے۔

ماہرؔ آروی کو ابتدا سے ہی شعر و سخن سے خصوصی دلچسپی رہی جس کے تحت اردو شاعری کے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔غزلیہ شاعری کے علاوہ نظم، رباعی، قطعہ، آزاد غزل، کہہ مکرنی اور دوہا نگاری میں بھی حصہ لیا۔اپنی شاعری میں بالترتیب پانچ اساتذہ کرام، سریرؔ کابریؔ، بسملؔ سہنساروی، تمناؔ عمادی اور قتیلؔ داناپوری سے اصلاح سخن اور مشورہ سخن کیا۔اردو شعر و شاعری کی ترویج وارتقا کی خاطر ''بزم ادب'' اور ''دائرہ ادب'' قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام متواتر نشستیں کراتے رہے اور کچھ کتابچے کی شکل میں ان ہی ادارے کے زیر اہتمام گلدستے بھی شائع کئے۔عارف ماہرؔ آروی کی تصنیفات وتالیفات اس طرح ہیں:

''جام وسبو'' (۱۹۶۵) ''متاع سخن'' (۱۹۶۶) ''بازگشت اول''، ''گلدستہ مشاعرہ'' (۱۹۶۹) ''بازگشت دوم''، ''گلدستہ مشاعرہ'' (۱۹۶۹) ''بازگشت سوم''، ''گلدستہ مشاعرہ'' ۱۹۶۹ ''آئینہ'' دیوان تاج پیامی (۱۹۷۱ء) ''سنگ گراں'' تیس غزلوں کا انتخاب (۱۹۷۱ء) ''آب بقا'' غالبؔ کی زمینوں پر ۳۵ غزلیں (۱۹۷۳ء) ''شاعری کی الف، ب'' (علم والعروض ۱۹۷۳) ''آرا جو ایک شہر ہے'' (۱۹۸۰ء) ''تفہیم وترسیل'' مذہبی مضامین کا مجموعہ (۱۹۸۹) ''خستہ تیغ ستم'' غالبؔ سے متعلق دس مضامین (۱۹۹۰ء) ''لوح وقلم'' مجموعہ مضامین (۱۹۹۱ء) ''آرا: ایک شہر سخن'' تذکرہ، تحقیق (۱۹۹۱ء)

اس کے علاوہ مزید نو کتابوں کے زیر طبع ہونے کی اطلاع تو ملتی ہے، مگر اس کی اشاعت کی کوئی خبر یا سند نہیں ملتی یا میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

عارف ماہرؔ صاحب سے میری کئی ملاقاتیں رہی ہیں۔وہ ایک نیک صفت اور بااخلاق انسان تھے۔وہ جب بھی ملے والہانہ انداز میں ملے اور مسکراہٹ کے ساتھ مصافحہ کیا۔اپنے کئی مختصر کتابچے اور کتابیں پیش کیں۔ان میں میرے مطالعے کے لئے سب سے اہم کتاب ''آرہ: ایک شہر سخن'' ہے۔اس کتاب میں انہوں نے بہت محنت اور جاں فشانی کی ہے۔تذکرے حاصل کرنے کے لئے آرا کے مضافاتی علاقوں میں قریہ قریہ چکر لگا کر پوری کتاب مرتب کی ہے۔آرا جو شاہ آباد کا خاص حصہ اور شہر رہا ہے اس کے علاوہ سہسرام بھی شاہ آباد کا حصہ تھا اور اس کے اطراف کے تمام علاقوں، قصبوں کا تذکرہ ضمناً اپنے مضمون ''پیش لفظ'' کے تحت کیا ہے جو انتیس (۲۹) صفحات پر محیط ہے۔اس میں تاریخ، تذکرہ، بزرگوں، دانشوروں اور شعرا کے اسمائے گرامی اور ان کی خاص شناخت کے ساتھ اذکار مع ترتیب درج کئے گئے ہیں جو بے حد معلوماتی اور کارآمد دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''آرہ: ایک شہر سخن'' میں جس قدر شعرا کا تذکرہ نظر آتا ہے یقینی طور پر ایک ''خزینۂ عامرہ'' سے کم نہیں۔اس کی حصولیابی کس قدر مشکل رہی ہوگی اس کا اندازہ محققین اور تذکرہ نگار ہی سمجھ سکتے ہیں۔اس کتاب کی تقریظ چودھری مشکور عالم بصیری نے لکھا ہے۔ان کا بیان ہے کہ:

''ش۔م۔عارف ماہرؔ آروی نے تحقیق کے مقرر کردہ اصول، قاعدے اور ضابطے کے اندر کام کیا ہے۔بغیر

مقدس دیوانگی کے کوئی کام نہیں ہوتا اور عارف ماہرؔ آروی میں یہ مقدس دیوانگی ہمہ وقت جھلکتی رہتی ہے۔ ایک ایک سطر، ایک ایک پرزہ اور شکستہ عبارتوں کی تحقیق میں عارف ماہرؔ آروی گلی گلی، محلّہ محلّہ، قریہ قریہ دور افتادہ گاؤں میں مارے پھرے۔ گرمی کی تپش وجلال، برسات کی بارش اور بھیگی ہوئی ہواؤں اور جاڑے کی منجمد کرتی ہوئی سردی کا کچھ خیال نہ کیا۔ جاڑے کی رات ہے، بس ایک کمبل اوڑھ کر جہاں جگہ ملی وہیں سوئے اور صبح کو پھر تحقیقی سراغ میں نکلے۔ اس کتاب کے مواد کی فراہمی میں عارف ماہرؔ آروی کو پورے چالیس برس لگ گئے جس کا مجھے ذاتی علم ہے۔'' (آرہ: ایک شہر سخن، ص ۲۹ وص ۳۰)

عارف ماہرؔ آروی اردو زبان وادب سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان وادب اور اس کے متعلق کتابیں، رسائل وجرائد ان کا اوڑھنا بچھونا تھے، تو غلط نہ ہوگا۔ وہ جب بھی ملتے شعروادب کی باتیں کرتے، میری کتاب ''دبستان عظیم آباد'' (مطبوعہ ۱۹۸۲) سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اس پر مضمون لکھوں گا۔ انہوں نے بتایا بھی تھا کہ کسی جریدہ میں ان کا وہ مضمون شائع ہوا۔ اگر چہ وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

وہ مختلف ادبی انجمنوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اس لئے روزانہ کسی نہ کسی انجمن میں ان کی شرکت رہتی تھی۔ پٹنہ (دبستان عظیم آباد) سے بھی خصوصی لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ ان کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین جریدے اور رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ خصوصی طور پر خدا بخش لائبریری کے جرنل میں۔

وہ اردو زبان کے کیسے سچے شیدائی اور مجاہد تھے اس کا اندازہ پروفیسر سمیع الحق کی ان باتوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے آب بقا'' (ماہرؔ آروی) میں لکھا ہے:

''اردو کی بقا کے لئے ماہرؔ صاحب اکثر آرہ کے نزدیک و دور کے قریہ میں جاتے رہتے ہیں۔ وہاں بچوں کو اردو لکھنے، پڑھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ انہیں پاس سے ابتدائی کتابیں، سلیٹ، پنسل وغیرہ مفت تقسیم کرتے ہیں اور انہیں کسی بزرگ کے حوالے کرکے اس بزرگ کی گمنام خدمت کرتے ہیں۔'' (بحوالہ جناب ماہرؔ آروی، شخصیت اور شاعری، تاجؔ پیامی، ص ۲۱)

جناب ماہرؔ آروی کی شخصیت بڑی ہی متاثر کن تھی۔ وہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں تاجؔ پیامی یوں لکھتے ہیں:

''واقعی ماہرؔ صاحب اوروں کی طرح نہیں ہیں۔ ماہرؔ صاحب کا خلوص ہی تھا کہ جب ۳۱/جنوری ۱۹۷۳ء کو 'آب بقا' پر عرض حال لکھنا ہوا تو میں نے بلا جھجک لکھا: 'اقلیم انسانیت کے شہنشاہ، بحر محبت سے مینارہ ضوبار، فضائے خلوص کے شہباز، دشت تحقیق کے صحرا نورد، صنم شاعری کے پرستار، شہر ادب آرہ کے قاضی اور حلقہ احباب کے گاندھی۔ یہ ہیں جناب ش-م-عارف آروی۔'' (بحوالہ جناب ماہر آروی، شخصیت اور شاعری، تاج پیامی مشمولہ کتاب آرا: ایک شہر سخن، ۱۹۹۱ء ص ۱۸ وص ۱۹)

ش-م- عارف ماہرؔ آروی کی شاعری کے متعلق یہ واضح ہے کہ انہیں

غالبؔ سے بڑی انسیت تھی۔اس مناسبت سے نہ صرف یہ کہ مضامین لکھے جو''خستہ تیغ ستم''میں موجود ہیں بلکہ ان کی غزلیہ زمین پر طبع آزمائی بھی کی اور بہت حد تک کامیاب ہوئے۔چند اشعار دیکھئے ؎

جلوہ زار آتش دوزخ ہی اس کو جانئے
دیکھنے میں زندگی یوں تو بہت گلفام ہے

موت کیا ہے ، حیات کیا ہے
آج تک حل یہ مسئلہ نہ ہوا

نیکی وہی ہے کر کے جو دریا میں ڈال دے
اپنی زباں سے کوئی بھی اس کا صلہ نہ مانگ

تم کو منظور نہیں اپنے تغافل سے گریز
ہم پہ بن آئی ہے ایسی کہ بنائے نہ بنے

درج بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب ماہرؔ نے غالبؔ کی زمین کو حیات دوام بخشی ہے۔ساتھ ہی غالبؔ کی فکر، آہنگ اور انداز بیان کو خوبصورتی کے ساتھ برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

جب ہم جناب ماہرؔ آروی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روایتی شاعری سے بغاوت نہیں کی بلکہ اس کی تقلید کی اور اس میں جدت طرازی کو پسند کیا۔اس کی سب سے بڑی مثال جدید صنف یا ہیئت کی وہ شاعری ہے جس پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے جیسے دوہا اور آزاد غزل وغیرہ۔بقول تاج پیامی:

''جناب ماہرؔ آروی کی شاعری میں قدیم وجدید قسم کے علائم کا استعمال بکثرت ملتا ہے.....فنی اعتبار سے ماہرؔ آروی کے یہاں بڑی سادگی، برجستگی اور بے ساختگی ہے۔وہ بڑی سادگی سے گہری بات کہہ جاتے ہیں۔''

(بحوالہ''جناب ماہرؔ آروی:شخصیت اور شاعری''ص۲۶وص۲۷)

جناب عارف ماہرؔ آروی کے کچھ منتخب اشعار بطور نمونہ دیکھئے ؎

منصب و شہرت کا طالب ہے جہاں
ہم بھی اوروں کی طرح ہو جائیں کیا

ترے کرم سے ترے دوست بھی رہے محروم
مری وفا نے ہر اک اجنبی کا ساتھ دیا

ایک دو لمحے مرے نزدیک بیٹھیں بھی تو آپ
آپ ہی سے عرض کرنی ہے حدیث دل مجھے

میں تو نثار ہوتا ہوں ماہرؔ خلوص پر
معلوم کچھ طریق عبادت نہیں مجھے

رہ کے چٹانوں کی بستی میں بھی گھبرائیں گے کیا
حال دل پتھر کو اپنا ہم سنا پائیں گے کیا

مصلحت بینی نہ آئی سچ جسے سمجھا ، کہا
تم نے تو تالاب کو بھی بارہا دریا کہا

بے نیازی تھا شعار اس کا مگر کیا کیجئے
جو ملا جیسا ملا جب بھی ملا اپنا لیا

ہر طرف جنگل اگا تھا خوف کا ماہرؔ مرے
آپ ہی ایسے ملے جس نے مجھے اچھا کہا

مختصر یہ کہ جناب عارف ماہرؔ آروی اگرچہ پوری زندگی خشک ترین اور پریشانی والجھن کی ملازمت میں گرفتار رہے، لیکن اردو شاعری کی زلف سنوارتے ہوئے خود کو اپنی اس دنیا میں خوش وخرم رہنے کی کوشش جاری رکھی اور اپنے غم کو بھلا کر ادب کی خدمت میں ہمہ صورت لگے رہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ تذکرہ''آرہ: ایک شہر سخن''(۱۷۴۷۔۱۹۴۷)ہے جس کے باعث وہ ادب کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔یہ وہ تحقیقی کارنامہ ہے جس سے خاکسار نے بھی اپنی تحقیقی کاوشوں میں مدد حاصل کی ہے۔ ❁❁

☆ عمل کے بغیر علم سقیم و بیمار ہے اور علم کے بغیر عمل عقیم و بیکار
☆ علم جان ہے عمل تن ہے، علم اصل ہے اور عمل فرع ہے
☆ علم ،عمل کو آواز دیتا ہے پس اگر وہ جواب دے تو ٹھہرتا ہے، ورنہ کوچ کر جاتا ہے

ڈاکٹر مسرت جہاں

Asst. Prof. Dept. of Urdu, Patna University, Patna (Mob. 8969042640)

قاسم خورشید: کچھ یادیں کچھ باتیں

ڈاکٹر قاسم خورشید ایک ہمہ جہت، متنوع صلاحیتوں کے حامل ادیب ودانشور تھے۔ وہ بیک وقت اردو و ہندی کے ممتاز افسانہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار، صحافی اور نشریاتی شعبے سے وابستہ ایک فعال شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ان کی تخلیقات میں فکری گہرائی، سماجی شعور اور ادبی جمالیات کی ہم آہنگی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مختلف پروگراموں میں ان کی شمولیت نے نہ صرف ان کی فنی صلاحیتوں کو جلا بخشا بلکہ ابلاغی دنیا میں ان کی شناخت کو مزید مستحکم کیا۔ محکمہ ابلاغِ عامہ میں ان کی خدمات ہمہ گیر نوعیت کی تھیں، جس کے ذریعے انھوں نے نوجوان نسل میں تخلیقی شعور اور فکری پختگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے علاوہ ایس سی ای آر ٹی، بہار میں نوزبانوں کی سربراہی کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی انجام دی۔

شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ، اپنی علمی و ادبی فعالیت کے سبب ایک نمایاں اور متحرک شناخت رکھتا ہے۔ یہاں کی فضا ہمیشہ سے علم وادب کے ذوق سے معمور رہی ہے، جہاں تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیقی وتخلیقی سرگرمیاں بھی پوری آب وتاب سے انجام پاتی ہیں۔ اس شعبے کے طلبہ، طالبات اور ریسرچ اسکالرز کو ملک کے ممتاز ادبا وشعرا اور ان کی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے وافر مواقع میسر آتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم خورشید سے راقمہ کی شناسائی اسی علمی وادبی ماحول میں ہوئی تھی، وہ اکثر وبیشتر یہاں کی علمی وتخلیقی نشستوں میں اپنی گراں قدر شرکت سے نہ صرف محفل کو رونق بخشتے بلکہ اپنے علم وتجربے کے قیمتی مشوروں سے حاضرین کو مستفید بھی کرتے۔ ان کی گفتگو میں علمی وقار، فکری گہرائی اور ادبی شعور کی آمیزش نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مرحوم ڈاکٹر قاسم خورشید کی مادرِ علمی بھی پٹنہ یونیورسٹی ہی رہی ہے۔ یہی وہ درسگاہ ہے جہاں سے ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ خواہ وہ افسانہ نگاری ہو یا ڈرامہ نگاری، شاعری ہو یا ریڈیو پر بطورِ عارضی اناونسر خدمات کی انجام دہی — ہر میدان میں انھوں نے اپنی انفرادیت اور خلوص سے کام لیا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے علمی و ادبی حلقے بجا طور پر ان پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے علم، فن اور اخلاقی وقار سے اس درس گاہ کا نام روشن کیا۔

جنابِ قاسم خورشید، ڈی۔ ڈی۔ بہار کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اردو ادبی پروگرام ''آئینہ'' کے ایک نہایت اہم رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس پروگرام کا مقصد اردو زبان وادب کے مختلف فکری، تخلیقی اور شعری پہلوؤں پر مکالمہ اور تجزیہ پیش کرنا رہا ہے۔ ان کے زیر نگرانی اس پروگرام میں متعدد یادگار نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں ادب وفن کے مختلف پہلو زیرِ بحث آئے۔ ایک موقع پر انھوں نے ''غزل: ایک نیم وحشی صنف سخن'' کے معروف قول کی روشنی میں ''غزل: ایک نیم وحشی روپ'' کے عنوان سے ایک نہایت بصیرت افروز نشست کا اہتمام کیا۔ اس علمی وفکری مجلس میں اردو ادب کے دو نامور نقاد و دانشور، پروفیسر علیم اللہ حالی اور پروفیسر اعجاز علی ارشد بطورِ مباحثین مدعو تھے۔ ساتھ ہی بطورِ ریسرچ اسکالر راقمہ کو بھی اس نشست میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ غزل کے رموز و نکات، اس کی فکری وفنی جہات اور داخلی کیفیات پر نہایت عالمانہ وسنجیدہ گفتگو ہوئی۔ مکالمے کا یہ سلسلہ محض نظریاتی نہیں بلکہ جمالیاتی اور تہذیبی شعور کا بھی مظہر تھا۔ اس پروگرام میں شرکت میرے لیے ایک یادگار تجربہ ثابت ہوئی — یادگار اس لیے کہ نہ صرف ٹی وی پر پیش ہونے کا یہ پہلا موقع تھا بلکہ دو جید ناقدین ادب کے درمیان مکالمہ کرنے کا موقع ملنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ یہ نشست بلاشبہ ڈاکٹر قاسم خورشید کے علمی ذوق، ان کی تنظیمی صلاحیت اور اردو زبان وادب کے فروغ کے تئیں ان کے اخلاص کی روشن مثال ہے۔

مرحوم قاسم خورشید اپنی ہمہ گیر شخصیت، نفیس ذوق اور مخصوص اندازِ زندگی کے سبب ہمیشہ ہی ہر محفل میں نمایاں رہے۔ وہ اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ میں بھی ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ کبھی ان کے سر پر ٹوپی یا ہیٹ یا کیپ سے ان کے وقار میں اضافہ ہوتا، تو کبھی گردن میں لپٹا ہوا دستمال ان کے ذوقِ جمالیات کی نمائندگی کرتا۔ یہ محض ظاہری آراستگی نہیں تھی بلکہ ان کی شخصیت کے تہذیبی شعور اور خود اعتمادی کی آئینہ دار تھی۔ ان کی تحریری اور فکری سرگرمیاں بھی اسی طرح ہمہ جہت تھیں۔ ان کے مضامین، افسانے اور تبصرے، ان کی تصاویر کے ساتھ، اکثر و بیشتر سوشل میڈیا پر گردش کرتے رہتے تھے اور اہل ذوق کے مابین علمی و فکری گفتگو کا باعث بنتے۔ ان کی تصانیف میں ''پوسٹر''، ''کینوس پر چہرے''، ''ریت پر ٹھہری ہوئی شام''، ''تماشا''، ''دل کی کتاب'' اور ''متن اور مکالمہ'' جیسی باقیات اپنی فکری گہرائی، تخلیقی تازگی اور اسلوبی تنوع کے باعث خصوصی اہمیت رکھتی ہیں، لیکن مجھے ان کی جس تحریر نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ہے: ''اب کیا کہیں، یہ قصہ پرانا بہت ہوا''۔ یہ مضمون انہوں نے اُس وقت تحریر کیا تھا جب پٹنہ یونیورسٹی اپنی صد سالہ تقریبات ۲۰۱۷ء کے موقع پر علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ایک بھرپور سلسلے میں مصروف تھی۔ ان تقریبات میں جہاں مضمون نویسی، بیت بازی، سمینار، سمپوزیم اور کھیلوں کے ذریعے ماضی کی درخشاں روایتوں کو دہرانے کی کوشش ہو رہی تھی وہیں مستقبل کے روشن امکانات کو بھی مستحکم اور مضبوط بنیاد فراہم کرنے کا جذبہ عملاً اپنے شباب پر تھا۔ انہی تقریبات کے دوران شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ دو روزہ سمینار بعنوان ''اردو زبان وادب کے فروغ میں پٹنہ یونیورسٹی کی خدمات'' میں ڈاکٹر قاسم خورشید کا یہ مضمون پیش کیا گیا تھا۔ یہ تحریر نہ صرف فکری و تنقیدی بصیرت کی مظہر ہے بلکہ اس میں پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے تئیں ان کے جذباتِ عقیدت بھی بھرپور انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ انہوں نے نہایت دلگداز لہجے میں لکھا ہے:

> ''پہلے ہمارے اساتذہ اپنے طالب علموں کے کیریر کو ہی اپنا مستقبل سمجھتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام تر اساتذہ کو وقت نے عظیم سے عظیم تر بنا دیا۔''
>
> (اردو جرنل ۹-۱۰، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ، ص ۷۳)

یہ جملہ اُن کی علمی وابستگی، اساتذہ سے قلبی ربط، اور تعلیم کے تئیں ان کے خلوص کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ اپنے اس مضمون میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> یہ زندہ حقیقت ہے کہ چاہے میں اپنی زندگی میں کسی بھی بڑے عہدے پر رہا، بے پناہ مصروفیات ساتھ رہیں، لیکن پٹنہ یونیورسٹی کا شعبہ اردو ہمیشہ میری ترجیحات میں رہا۔ اس وقت مجھے اور بھی تقویت کا احساس ہوا جب شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے دربھنگہ ہاؤس میں مختلف یونیورسٹی کے اساتذہ کے ریفریشر کورس کا اہتمام کیا گیا اور مجھے بحیثیت اسپرٹ لکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا۔ میری یادیں روشن ہوگئیں کہ جہاں برسوں، میں ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران اپنے اساتذہ کو سنا کرتا تھا اسی ہال میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ خود لکچر دے رہا تھا اور پھر تا حال اس شعبے کے بیشتر پروگراموں میں بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کا شرف حاصل ہوتا رہا۔'' (ایضاً، ص ۷۵)

قاسم خورشید: اردو ہندی کے بین الاقوامی تخلیق کار

اردو ہندی کے بین الاقوامی تخلیق کار قاسم خورشید کو فطری طور پر ہمہ جہت کہا جا سکتا ہے۔ پوری شدت اور معنویت کے ساتھ ان میں جو تخلیقیت اور صناعی موجود ہے ہمارے ادب میں ایسا کم کم ہی نظر آتا ہے۔ فکشن، شاعری اور اپنے تخلیقی مضامین سے انہوں نے ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔ بہترین ڈرامہ نگار، ٹیلی ویژن کے ہدایت کار، رائٹر اور آرٹسٹ کے طور پر بھی ان کی بیحد معیاری شناخت ہے۔ ان کی کتاب ''تماشا'' اردو اسٹیج ڈرامہ کے لئے سنگ میل ہے، کیونکہ ان سے پہلے باضابطہ طور پر اسٹیج کی تکنیک اور تخلیق کے حسین امتزاج سے مزین اتنے کامیاب ڈرامے نہیں لکھے گئے ہیں۔

(سلام بن رزاق)

قاسم خورشید کا یہ بیان صرف خودستائی کا اظہار نہیں ہے، بلکہ ایک بڑا اعتراف حقیقت ہے جس میں اپنی مادرِ علمی اور اپنے اساتذہ کے عقیدت مندانہ تذکرے کی خوشبو رچی بسی ہے۔

بلاشبہ قاسم خورشید کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جن کی زندگی عمل، حرکت اور خلوصِ نیت سے عبارت تھی۔ ایک پروگرام ختم ہونے نہ پاتا کہ وہ دوسرے کی تیاری میں منہمک ہو جاتے۔ ان کی کشادگی ذہن اور مزاج کا کھلا پن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی محفل میں نہایت خندہ پیشانی سے شریک ہوتے، جہاں سے کوئی دعوت ملتی اسے خوش دلی سے قبول کرتے اور بغیر کسی تکلف یا شان و شوکت کے حاضر ہو جاتے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے ایک بار نہیں بار بار ان کے ایسے کئی رویے دیکھے جن سے ان کی عاجزی، انکساری اور انسانی قدروں سے وابستگی کا بھرپور اظہار ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی کے دل پر بوجھ نہ پڑے، کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

میرے لیے وہ لمحہ نہایت یادگار اور بامعنی تھا جب یونیورسٹی سروس کمیشن کی جانب سے اسسٹنٹ پروفیسر کا نتیجہ منظر عام پر آیا۔ اسی روز محترم قاسم خورشید صاحب کا فون موصول ہوا۔ ان کی گفتگو میں خلوص، محبت اور شفقت کا عجب امتزاج تھا۔ انہوں نے مبارکباد کے ساتھ نیک تمنائیں اور مستقبل کے لیے دعائیں دیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل ان کے بلند اخلاق، سادہ مزاجی اور قلبی صفائی کا آئینہ دار تھا ـــــ وقت گزر گیا، مرضی مولا، وہ خود بھی گزر گئے، مگر ان کی محبت بھری آوازیں آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ حق مغفرت کرے..... ❁❁

قیصر عثمانی: کچھ یادیں..... (ص ۵۰ سے آگے)

یہ خبر دی تو ان دونوں کو بھی شدید صدمہ پہنچا۔ انیل کاؤش کے والد محترم سی۔ ایل کاؤش کا ظفر اوگانوی سے غائبانہ تعارف تھا اور وہ ان کے چند افسانوں سے متاثر تھے اور دیپک کنول تو ان کے مرید تھے، لہٰذا ہم تینوں دوسرے دن مل بیٹھے اور تعزیتی نشست کا پروگرام بنایا۔ دیپک کنول نے کہا ''یہ پروگرام قیصر عثمانی کی ادبی تنظیم کے زیر اہتمام کرنا بہتر ہوگا۔'' اس پر ہم تینوں متفق ہو گئے اور دوسرے دن قیصر عثمانی سے ملنے کے لئے ملاڈ چل پڑے۔ ان سے ملاقات کر کے ساری باتیں بتائیں تو وہ بخوشی ''ادبی سنگم'' کے زیر اہتمام یہ پروگرام کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور ہفتہ دنوں بعد یہ پروگرام باندرہ کے ایک ہوٹل کے وسیع ہال میں انجام پذیر ہوا۔

اس پروگرام کے بعد قیصر عثمانی سے میری ملاقات نہیں ہو پائی کیونکہ میں کافی مشغول ہو گیا۔ کبھی تو کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے ممبئی سے باہر چلا جاتا تو کبھی فلم ساز اور ڈائرکٹرز سے وقت معینہ پر ملنے جانا پڑتا۔ قیصر عثمانی کے انتقال کے دن فلم ساز اسرار انصاری کے ساتھ ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے او۔ ٹی گیا ہوا تھا، اسی جگہ دیپک کنول کا فون آیا:

''قیصر عثمانی صاحب آج (۲۰ دسمبر ۲۰۰۰ء) شام میں انتقال فرما گئے۔ اگر آپ کو وقت ملے تو تجہیز و تکفین میں شامل ہو جائیں۔''

لیکن صد حیف! میں ان کی تجہیز و تکفین میں شریک نہیں ہو سکا، کیوں کہ میری کہانی پر ہی فلم بن رہی تھی ایسے حالات میں کیسے شریک ہو سکتا تھا؟..... بس یادیں..... یادیں اب بھی زندہ ہیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین! ❁❁

متن اور مکالمہ سے وابستہ ایک اہم سوال

تخلیقی ادب کی تنقید کا کوئی منشور نہیں ہوتا، یہ ممکن بھی نہیں ہے، حالانکہ اصول وضع کئے جاتے رہے ہیں، بحثیں ہوتی رہی ہیں، ہنوزیہ سلسلہ قائم ہے، ادبی تحریکیں تخلیق کے بطن سے ہی ابھری ہیں، یعنی ادب پہلے وجود میں آیا اور پھر اپنی ترجیحات کے تحت اسے تحریک یا تحریکوں کا حصہ بنایا گیا۔ اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ فی الحال یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ ہم تخلیق کار کو ہی اپنا نقاد تصور کریں یا پھر نصابی تنقید نگار کی آرا کے تحت تخلیق کے مستقبل پر منحصر کریں۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری
HOD, Urdu, CCS University,Meerut - 250001 (Mob.09456259850)

افسانے

بازار

گاؤں کی چوپال پر بھیڑ لگی تھی۔ ہر کوئی تماشے والے کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔تماشا دکھانے والے نے پہلے بہت دیر تک ڈگڈگی بجائی۔ وہ ڈگڈگی تب تک بجاتا رہا، جب تک اس کے من موافق بھیڑ نہیں جمع ہوگئی۔ جب بھیڑ جمع ہوگئی اور لوگوں نے خود ہی گول گھیرا بنالیا، تو اس نے ڈگڈگی بجانا روکا۔ ڈگڈگی کو اپنے چیلے کو دیتے ہوئے وہ بھیڑ سے مخاطب ہوا۔

''لوگو! خاموش ہو جاؤ.....''

یہ کہتے ہوئے وہ ایک پل کو رکا۔ جب سب طرف خاموشی پسر گئی تو دوبارہ گویا ہوا۔اس کی آواز میں بڑا درد تھا:

''میں آپ کو تماشے اور جادو دکھاؤں گا۔ایک سے بڑھ کر ایک جادو۔شاید ایسے جادو آپ نے دیکھے نہ ہوں اور ہوسکتا ہے کچھ لوگوں نے دیکھے بھی ہوں۔بس شرط خاموشی ہے۔''

یہ کہہ کر جادوگر خاموش ہوگیا تھا۔اس کا حلیہ عجیب تھا۔ اس نے بنیان اور ایک تہبند پہن رکھا تھا۔سر پر انگوچھا لپیٹ رکھا تھا۔ پیروں میں معمولی قسم کی ہوائی چپل تھی۔اس کا رنگ تو صاف نہیں تھا۔ ہاں پکا کہہ سکتے ہیں۔عمر یہی کوئی پچاس کے لپیٹے میں ہوگی۔ چہرے پر ہلکی موچھیں جن پر پسینے کی بوندیں گویا گھاس پر اوس ہو۔

ایک اس کا چیلا تھا، جس کی عمر دس سال ہوگی۔ پھٹی ہوئی اپنی عمر اور جسم سے بڑی قمیص اور پاجامہ۔اسے پاجامہ کہنا بھی مشکل تھا کہ اس کی لمبائی گھٹنوں سے کچھ زیادہ تھی۔شکل سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا جادوگر اور چیلے میں کوئی رشتہ تھا۔

اب بھیڑ خاموشی کا لبادہ اوڑھ چکی تھی۔ سناٹا پسرا تھا۔ لوگوں کی زبانوں پر تالے تھے۔یعنی وہ پوری طرح تماشہ دیکھنے کے لئے سنجیدہ تھے۔ دائرے نما بھیڑ کے اندر جادوگر اور اس کا چیلا گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جادوگر کی بھاری آواز بلند ہوئی:

''لوگو! میں آج طرح طرح کے جادو اور تماشے دکھاؤں گا۔ ہوا میں گلاس والا جادو.....اخبار سے نوٹ بنانے والا جادو.....بھیڑ کے بٹوے غائب کرنے والا تماشہ.....ہوا میں عورت والا جادو.....کبوتر نکالنے والی ہاتھ کی صفائی.....حلق سے بلیڈ کی لڑی نکالنے کا کمال..... لڑکے کا قتل.....اور بہت کچھ.....مگر.....؟''

جادوگر روہانسا ہوگیا۔بھیڑ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ یہ مگر..... کیا؟ بہت سارے چہروں پر سوالیہ نشان چپک گئے تھے۔انہیں جادوگر کے ''مگر'' میں بلا کا درد محسوس ہوا۔جادوگر کی کیفیت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔

بھیڑ میں اضطراب چھایا تھا۔ سب کو جادوگر کے اگلے جملوں کا انتظار تھا۔اتنے میں بھیڑ سے ایک آواز ابھری:

''جادوگر ہمیں بتاؤ.....تمہارے ساتھ کیا ہوا؟''

''ہاں.....ہاں.....بتاؤ.....''

ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''ہاں میں بتا رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے رکا:

''.....اصل بات یوں ہے کہ میں ایسے نگر کا باشندہ ہوں، جہاں کبھی امن ہی امن تھا۔تشدد نام کو نہیں تھا۔میرا نام گلاب ہے۔میں اسی نگر کے ایک دور دراز علاقے میں گاؤں میں رہتا تھا۔لوگوں کو تماشے دکھاتا، جادو کے کھیل سے سب کو حیرت میں ڈالتا۔میری چرچا سب طرف پھیل گئی۔ میرے فن اور ہاتھ کی صفائی کے سب مرید تھے۔اس طرح میں اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ارے میں بھی کتنا بے وقوف ہوں کہ میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں، میری بیوی۔ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔بس یہی میرا خاندان تھا۔ہم لوگ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔''

جادوگر بولتے بولتے اچانک رک گیا تھا۔ کچھ کے منھ حیرت واستعجاب سے کھلے اور ادھ کھلے رہ گئے تھے۔ عورتوں اور عمر رسیدہ لوگوں میں زیادہ بے چینی تھی۔ وہ قیاس لگا رہے تھے کہ آگے کیا ہوا ہوگا؟ اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے پوچھا۔

''یہاں کیسے آئے؟ یہ اس ملک کا اتنا لمبا سفر.....؟ کیا یہ چیلا تمہارا بیٹا ہے؟ تم نے اسے پڑھایا نہیں؟''

جادوگر نے بھیڑ کے چہروں کے استعجاب کو پڑھ لیا تھا۔ مختلف سوالات بھی اس نے سن لئے تھے۔ وہ اپنی کہانی ایک ماہر قصہ گو کی طرح سنا رہا تھا۔ ایک فرق تھا کہ وہ اپنی آپ بیتی بیان کر رہا تھا۔ سننے والے جادو وادو، تماشے وماشے بھول گئے تھے۔ انہیں تو جادوگر کی حقیقی کہانی میں لطف آرہا تھا۔ زندگی بھی کتنی عجیب ہے۔ کسی کی زندہ کہانی اسے خون کے آنسو رُلاتی ہے تو کسی کے لئے مزے اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ جادوگر کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ وہ تقریباً روتے ہوئے بولا:

''ایک میلے میں ہم سب لوگ تماشا دکھا رہے تھے۔ تماشا دکھاتے ہوئے ہمیں یہ چوتھا دن تھا۔ ہم نے خوب پیسے کمائے تھے..... موٹی رقم پولس والوں کو دی، مگر وہ لوگ خوش نہیں ہوئے۔ میلہ کمیٹی کو ہم پہلے ہی رقم دے چکے تھے، پھر بھی ہمارے پاس گزارے سے زیادہ رقم بچی تھی۔ ہم لوگ محنت بھی خوب کر رہے تھے۔ چوتھے دن ایک خطرناک بات ہوئی۔ ہم لوگ جادو دکھا رہے تھے۔ موت کا کھیل چل رہا تھا۔ میری بیٹی، میری دنیا، میری زندگی کا حاصل، لال کپڑا اوڑھے قتل ہونے کے لئے تیار تھی۔ یہ قتل اصل میں نہیں ہوتا، مگر دیکھنے والوں کو لگتا تھا یہ اصلی ہے۔ خون میں سنا چاقو، میں اور بیوی بیٹے کا رونا چلانا، سب فرضی ہوتا تھا۔ یہ جادوگروں کو پتہ ہوتا ہے۔ بھیڑ میں داڑھی والا سامری بھی شامل تھا۔ کبھی اس کے اور خاندان والوں کے گہرے مراسم تھے، لیکن اب کئی سالوں سے ان سے شدید دشمنی تھی۔ جادوگر ایک دوسرے کا راز جانتے ہیں اور پھر وہ تو بڑا جادوگر تھا، اسی لئے اس کو سب سامری کہتے تھے۔ مجھے پتہ نہیں تھا وہ بھی بھیڑ میں شامل ہے۔ وہ ہماری روزانہ کی کمائی سے جل گیا تھا۔ پولس والے بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ایک عام آدمی کو جادوئی راز بتا دیے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر ایسا کچھ کیا کہ وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

اتنا کہہ کے جادوگر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ چیلا بھی جادوگر سے لپٹ کے رو رہا تھا۔ بھیڑ میں کئی لوگوں کے بھی آنسو رواں تھے۔ عورتوں کی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ بے آواز بھیڑ سے یکے بعد دیگرے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''پھر کیا ہوا.....؟''

''کیا لڑکی سچ مچ مر گئی.....؟''

''روؤ مت.....''

بھیڑ کی ہمدردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سب اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب سامری کے خلاف غصے میں تھے۔ ایک نے بڑھ کر چیلے کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ بھیڑ کے چہرے اداس تھے۔ حیرت اور اضطراب ان کے چہروں کا طواف کر رہے تھے۔ آنسو پونچھتے ہوئے جادوگر دوبارہ مخاطب ہوا:

''لوگو! اس دن غضب ہو گیا۔ اس سامری کی چال کامیاب ہوئی اور.....اور..... میری بیٹی کا حقیقت میں قتل ہو گیا۔ میں، اس کی ماں اور ہمارا بیٹا سب رو رہے تھے۔ چیخ اور چلا رہے تھے۔ دوسری طرف لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ خوش ہو رہے تھے۔ سیٹیوں کی آوازیں اور بے انتہا شور.....لوگ پیسے پھینک کر گھر جا رہے تھے۔ ہم رو رہے تھے۔ سینہ کوبی کر رہے تھے۔ تماش بین جا چکے تھے۔ روتے ہوئے میں نے دیکھا قہقہے لگاتا سامری بڑی شان سے چل کر جا رہا تھا۔ پولس والے بھی کچھ دوری پر کھڑے تھے۔ میں پورا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ بیٹی کا قتل ..... لوگوں کے قہقہے.....سب سمجھ میں آ گیا تھا۔ پولس والوں کو ابھی خبر نہیں تھی کہ واقعی قتل ہو گیا ہے، ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ کسی طرح ہم نے بیٹی کے مردہ جسم کو وہاں سے نکالا'' جادوگر کے ہونٹ رکے۔ آواز بند ہو گئی۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ جادوگر کی آواز پھر گونجی:

''لوگو بس کچھ دیر اور..... پھر میں آپ کو اچھے اچھے تماشے دکھاؤں گا۔ کچھ دن بعد یہ ہوا کہ اس سامری نے لوگوں پر عجیب قسم کا سحر طاری کر دیا، لوگ خون کے پیاسے ہو گئے۔ ہر طرف بد امنی اور افراتفری پھیل گئی۔ کچھ دن بعد خبر ملی کہ سامری اس علاقے کا بادشاہ بن گیا۔ بس پھر کیا تھا، ہمیں وہ نگر چھوڑنا پڑا۔ یہ میرا کل اثاثہ ہے۔ میرا

بیٹا.....میرا چیلا.....کئی سال سے بھٹکتے بھٹکتے ،تماشہ دکھاتے ہم لوگ ادھر آ گئے۔اب کئی سال سے ہم ادھر ہی ہیں.....

آپ لوگوں سے میری بنتی ہے.....پرارتھنا ہے.....ہاتھ جوڑ کے اپیل ہے کہ آپ میں کوئی جادوگر ہو تو وہ سامنے آجائے اور ہماری مدد کرے۔ہمارے جادو میں رکاوٹ نہ ڈالے۔میں اپنی دس سال کی بچی کھو چکا ہوں۔اب بیٹا نہیں کھونا چاہتا۔''

بھیڑ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج۔لوگوں کی سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔بھیڑ میں ہر کسی کو ایک دوسرے پر شک تھا،مگر کوئی آگے نہیں آیا۔چیلے کی آواز ابھری:

''استاد.....کام شروع کرو۔ان میں کوئی سامری نہیں۔''

جادوگر نے طرح طرح کے کھیل تماشے دکھائے۔جادو دکھائے۔ہاتھ کی صفائی دکھائی۔آخر میں لال کپڑے میں چیلے کو بند کیا۔قتل کا جادو شروع ہونے والا تھا۔بھیڑ میں سناٹا پھیلا تھا۔ہوا بھی سانس روکے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔پیڑ پودے، چرند پرند سب خاموش تھے۔تماشے کا آخری سین آنے والا تھا۔اتنے میں جادوگر کی آواز خاموشی کا قتل کرتے ہوئے واضح ہوئی:

''لوگو مجھے یقین ہے۔یہ آخری تماشا آپ کو مزہ دے گا۔ہم نے اس کے لئے خوب تیاری کی ہے۔اس کو دیکھ کر ہی جائیں اور پیسے دینا نہ بھولیں۔مجھے پتہ ہے آج کل بے روزگاری بہت ہے۔یہ بھی کہ ایسے تماشے دیکھنے امیر لوگ نہیں آتے ،بھوکے، بیروزگار، دبے کچلے، سماج کے حاشیے پر زندگی گزارنے والے، بے گھر و بے در لوگ،مگر میری پھر بھی بنتی ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ڈالیے گا۔ہم لوگ تھوڑے ہی پر صبر کر لیں گے.....اور لیجئے یہ آخری تماشا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے دائرے میں چاروں طرف زور زور سے چلتے ہوئے ڈگڈگی بجائی۔گویا یہ دنیا کا آخری تماشہ ہو،جس کے بعد تماشے والا ہوگا نہ تماش بیں۔ڈگڈگی کی آواز میں بھی ایک درد تھا۔چیلا کپڑے کے اندر جا کر لیٹ چکا تھا۔بس جادوگر کی چھری چلانے کی دیر تھی۔لوگوں پر سکتہ طاری تھا۔

''اور یہ لو.....'' یہ کہہ کر جادوگر نے کچھ لفظ بدبدائے اور کپڑے کے اوپر چھری چلا دی۔ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔لوگوں کی تالیاں،سیٹیاں،خوشی مناتے بچے۔جادوگر روتا بلکتا رہا۔تماش بین اسے بھی تماشے کا حصہ سمجھتے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔لوگ ریزگاری اور نوٹ پھینک کر جاتے رہے،شور بلند ہوتا رہا۔جادوگر روتا رہا۔چیلا تڑپتا رہا۔روتے ہوئے جادوگر نے قہقہہ لگاتے ہوئے زرد رنگ میں ملبوس سامری کو دیکھا۔

❁❁❁

تازہ نگارشات مطلوب ہیں

اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کے لئے قلم کار حضرات شعری ونثری صنف ادب پر اپنی غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ،تازہ ترین تخلیقات ہمیں ارسال کریں۔آپ کی معیاری ادبی وتنقیدی اور تحقیقی وتخلیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ آپ کی ایسی تخلیقات کا بھی ہمیں خصوصیت سے انتظار ہے جو اصناف ادب کی تاریخ، اس کے فن پر ہوں اور مقابلہ جاتی امتحانات کے طلبا و طالبات کے لئے مفید مطالعہ ہوں۔ہمیں بچوں کے لئے بھی نثری وشعری تخلیقات خصوصاً مختصر مضامین، کہانیاں اور نظمیں مطلوب ہیں۔تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویریں بھی ارسال کریں۔نگارشات صفحہ کے ایک طرف املا وانشا کی غلطیوں سے پاک صاف اور خوش خط لکھی ہوئی ہوں یا صحت وصفائی کے ساتھ کمپوز شدہ ہوں۔ساتھ ہی نام مکمل پتہ اردو اور انگریزی میں،ڈاکخانہ کا پن کوڈ، اپنے موبائیل کا نمبر بھی لکھیں اور بینک کھاتہ جس نام سے ہے وہ نام، کاؤنٹ نمبر، آئی ایف کوڈ بھی لکھیں۔تخلیقات کے ساتھ غیر مطبوعہ غیر نشر شدہ خاص برائے ''زبان وادب'' لکھنا بھی نہ بھولیں۔تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر کا فیصلہ حتمی ہوگا۔تخلیق کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں،زیراکس یا فوٹو اسٹیٹ کاپی نہ بھیجیں۔ (مدیر/معاون مدیر''زبان وادب'' اردو بھون، چوہٹہ،اشوک راج پتھ، پٹنہ۴ ۸۰۰۰۰۴)

خورشید حیات
Qr. No. 16/3, New N.E.Colony, Bilaspur-495004(C.G) (Mob. 09752475934)

پہاڑ، ندی، عورت

سامنے والی برتھ پر بیٹھی وہ، اپنی انگلیوں میں پھنسے برش سے، کینوس پر اتر آئے الگ الگ رنگوں میں بہت پیچھے کی طرف چھوٹتی ہوئی زندگی کے ان گلیاروں کو ڈھونڈ رہی تھی جہاں مٹکن چٹکن دھی چٹاکن کا کھیل تو تھا مگر لکیریں نہیں تھیں۔ بے چینی کے عالم میں اس نے ون-ایچ اے (HA-1) کوچ کی کھڑکی سے سرمئی بادلوں کے ان سلسلوں کو دیکھنا چاہا جو کبھی ساون کے موسم میں دوارکا سے تغلق آباد اور حضرت نظام الدین سے ہری دوار تک کے سفر میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے، مگر ایک آج کا ساون ہے، بادلوں کے سلسلے تو ہیں، مگر اپنی صفات سے باہر ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے، الگ الگ قبیلوں میں بنٹے ہوئے۔ اب قبیلہ کہاں، معاشرہ کدھر؟

آج ہمارا معاشرہ ٹو۔بی۔ایچ کے (2BHK) فلیٹ میں اکڑوں بیٹھا ہے، اور سنہری تہذیب کا آنگن گمشدہ پنچھی کی طرح غائب۔

ایک طرف پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے کھیت، کھلیان، دوسری طرف ماہی گیروں کی بستیوں میں مچھلیوں کو ندیوں کے خلاف ورغلایا جا رہا تھا۔ مذہبی، نسلی اور لسانی گروہوں کی کشیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔

ٹائر کی چپل پہنے ایک بوڑھا، آنکھوں پر، پاور کے چشمہ کو، موٹی سُتلی سے کانوں میں پھنسائے، ماڈل اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر دو پر کھڑا، بھاگتی ہوئی ٹرین کی رفتار کو دیکھ رہا تھا۔

وہ کھڑکی سے کچھ اس قدر چپکی ہوئی تھی کہ اس کے رخسار کا سرخ رنگ کانچ کی کھڑکی پر ابھر آیا تھا، پیشانی پر لکیریں تھیں اور آنکھوں میں بادلوں سے جھانکتا ہوا سورج۔ بھاگتی ہوئی ٹرین کا اپنا ایک رنگ تھا۔ WAP7 LOCO کی Level Xing Gate پر چیختی ہوئی آوازوں سے بے خبر، رنگ برنگی روشنی میں لپٹے ہوئے، بے کیف چہرے، انجام سے بے خبر ٹریک پر چل رہے تھے۔

ہر زندگی رنگ کی اپنی دھڑکن ہوتی ہے اور ہر دھڑکن میں زندگی کی سانسیں۔ ان سانسوں پر ہمارا اختیار کہاں، اف یہ زندگی بھی نہ جانے خود کو کیا کیا سمجھ بیٹھتی ہے۔ سوئے ہوئے شہر کو جگانے والے چہرے یہاں پر ہی کہانی کردار بن جاتے ہیں۔

میرے اندر یہ کون بول رہا ہے۔

شاید یہ وہی شہزادی ہے جو جسم کی سرحدوں کو توڑ کر روح کی قبا کے ساتھ بہت دور نکل جاتی ہے، لوٹ آتی ہے اور پھر چلی جاتی ہے، چھوڑ جاتی ہے، رنگوں کی خوشبوئیں اور خوابوں کی آہٹیں، پھر شروع ہوتا ہے خود سے خود کے مکالمے کا کبھی ختم نہ ہونے والا ایک نیا سلسلہ۔

کہیں یہ وہی شہزادی تو نہیں جو سادگی کے لباس میں لپٹی ہوئی سامنے والی برتھ پر بیٹھی اجالوں میں رنگوں سے کھیل رہی ہے۔ نئے سروں کے ساتھ اے سی کوچ کی ٹھنڈی ہواؤں میں گھل مل رہی ہے۔

دونوں ایک ہی دشا کے مسافر تھے۔ وہ رنگوں میں زندگی تلاش کر رہی تھی اور ''وہ'' ان رنگوں میں اپنی شہزادی کو دیکھ رہا تھا۔ ''میں'' میں اتر کر ''میں'' کی تلاش اب کہاں کوئی کرتا ہے اب تو صرف وہ اور وہ سب کی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ دو ہاتھ کس کے ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں اور چند لمحوں میں معصوم پرندوں کے پر کتر کر چلے جاتے ہیں اور پھر شروع ہوتا مہاجرت کا ایک نیا قصہ۔ خوف و دہشت کی چادر میں لپٹے ہوئے چہرے اپنے اپنے گھونسلوں کے بکھرے ہوئے تنکوں سے جھانکتے ہیں اور صحافی کا کیمرہ ان کا پیچھا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ شہر جس کی تہذیب کی پہچان وہاں کی شام ہوا کرتی تھی، وہاں آدمی کا جنگل تو ہے، مگر درختوں کی بازوئیں کٹی ہوئیں، ترقی کرتے ہوئے شہر کے آدمی کی نگاہیں جب جب برہنہ ہوئیں تو درخت ننگے، اور جڑیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔

سنتے ہیں وہ شہزادی جب سے داستان رنگ حویلی کو چھوڑ کر چلی گئی وہاں اب کسی آسیب کا سایہ ہے اور اس حویلی کے سامنے پہاڑ کی مضبوط بانہوں سے آزاد ہوتی ہوئی ندی کے اطراف میں جھاڑ پھونک والوں کی دکانیں آباد ہو چکی ہیں۔ آدھا ادھورا آدمی سب کی مرادیں پوری کرنے والا بن گیا ہے۔

او میری شہزادی تم حویلی چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟ زندگی میں پل کتنے تھے شہزادی نے کبھی نہیں گنا، ہتھیلی کی نرم انگلیاں تو تھیں، مگر ان انگلیوں پر گنتی گننے کا سلیقہ اسے کبھی نہ آیا۔ ہر لمحہ میں خوشیاں کتنی تھیں؟

موسم کے خوبصورت مزاج کے ساتھ جب کبھی شہزادی حویلی سے، بہت دور نکل جانے والی پگھاؤں سے گزرتی، ایک سفید روشنی اس کے قدموں کی آہٹ سے آگے چلتی دکھائی دیتی۔

اس کے جسم سے لپٹے ہوئے چوڑی دار اور کرتے کی ہر سلائی میں روح کے دھاگے تھے۔ وہ ہر جگہ موجود تھی اور نہیں بھی تھی۔ پتا نہیں وہ کس دیار میں کس کے اختیار میں تھی۔

سامنے کی برتھ پر بیٹھی وہ پینٹنگ مکمل کر چکی تھی۔ اور دوسری طرف وہ اب بھی اس کے چہرے میں اپنی شہزادی کا چہرہ پڑھ رہا تھا کہ شہزادی بھی تتلیوں کے رنگوں کو زندگی کے کینوس پر اتارا کرتی تھی۔

ہر ماں کا چہرہ وہ اتنے قریب سے کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟ کیوں زندگی کی کتاب چہرے کے ہر ورق کو قمقموں سے سجانا چاہتا ہے؟

شاید وہ زندگی کے ہر ورق سے ابھرنے والی عورت، سمندر اور سڑک یا پھر ندی، سڑک پہاڑ کی موسیقی کو زندگی کے سر اور تال کے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔

آج تک خود کو وہ پہچان نہیں سکا۔ اس کا چہرہ سمندر، پہاڑ جیسا ہے یا پھر ندی جیسا۔

شاید اس کی آنکھوں سے ایک ندی بہتی ہے جو سمندر کو ایک نئی پہچان دے جاتی ہے۔ ندی پچھلے موسم کی، شہزادی۔ سمندر آج کا مرد اور پہاڑ؟ روشنی میں نہائی ہوئی سڑک.....؟

اس نے کئی مرتبہ خود کو آوازوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے محسوس کیا ہے۔

پاپا آج ہاسٹل میس سے کھانا نہیں آئے گا؟

کیوں.....؟

''آج گنیش پوجا ہے''

''کیا کھاؤ گی؟''

''ویج بریانی، گوبھی مٹر آلو، گاجر، سویابین، فرشبین اور شملہ مرچ سب ڈال دینا۔''

الگ الگ کھیتوں میں اُگی ہوئی یہ سبزیاں جب ایک ساتھ ملتی ہیں، چاول کے دانوں کے ساتھ، گرم مسالوں کے ساتھ، بھاپ سے پکتی ہیں تو ایک نئی خوشبو کچن سے نکل کر پڑوس کے کچن تک سرحدوں کو توڑتے ہوئے پہنچ جاتی ہے۔ خوشبوئیں لکیروں کو نہیں مانتیں۔ یہ ہوائیں کتنی معصوم ہوتی ہیں۔ یہاں تہذیب کی نہ تو کوئی جنگ ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی دیواریں۔

تم نے کہا/ اندھیرا ہے/ اس نے کہا اجالا/ پھر تم نے کہا اجالا ہے/ اس نے کہا اندھیرا/ تم نے کہا گنبدوں سے صدائیں آ رہی ہیں/ اس نے کہا اونچے پہاڑوں سے ایک نئی جاگرتی لیے مندا کنی ململ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی اتر رہی ہے/ تم نے پھر کہہ دیا نہیں/ اس ہاں اور نہیں میں/ کتنے دور ہو گئے تم/ اندھے اور بہرے بھی/ کہہ دو نا/ نہیں، نہیں، نہیں۔ کوئی نہیں/ صرف ''وہ'' / دیکھو نا/ سنو نا پورے برہمانڈ سے ہر لمحہ ایک ہی آواز آتی ہے/ چلو پیچھا کرتے ہیں فطرت کی گود سے ابھرنے والی آوازوں کا/ پرندوں کی طرح، لہروں کی طرح۔ تھوڑی دیر مون رہ کر ہم خود میں خود کی تلاش کیوں نہیں کرتے؟

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' رنگوں سے کھیل رہی اس عورت نے خاموشی کو اپنی آواز دی۔ شاید اس کی پینٹنگ مکمل ہو چکی تھی۔

''جی، میں''— جہاں تک یہ ٹرین جا رہی ہے۔

''مطلب ہری دوار۔''

''جی ہاں''

''میں بھی۔''

تنہا سفر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے نا، خاص کر تب جب سفر لمبا ہو اور باتیں کرنے والا کوئی نہیں۔

''کیوں ایسا کیوں؟'' اپنے کینوس، برش اور رنگوں کے سمیٹتے ہوئے، اس نے اپنے بیگ سے کیمرہ نکالا اور قریب آ کر کیمرے میں قید اپنی پینٹنگ دکھانے لگی۔ اس کی پینٹنگ کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں بھی بول رہی تھیں کہ آج نئی صدی میں انگلیاں بولتی ہیں اور زبان خاموش رہتی ہے۔ کبھی انگلیاں کی بورڈ پر تھرکتے ہوئے باتیں کرتی ہیں تو کبھی انگلیوں میں پھنسے برش رنگوں کو ایک نئی زبان عطا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

حنائی رنگ زلفوں کو بکھیرتے ہوئے اس نے پوچھا:

''تمہارا نام.....؟''

''ندی''

'اچھا اچھا تم خود کو ندی سمجھ بیٹھے ہو۔ لگتے تو ہو پہاڑ جیسے مضبوط ارادے والے۔''

''کسی حد تک ٹھیک ہی سمجھا تم نے، ایک ایسا پہاڑ جس کی مضبوط بانہوں سے ندی آزاد ہوتی ہے۔ آج تو بارودوں سے اس کی پسلیاں توڑی جا رہی ہیں۔''

''اُف یہ بارود سے ٹوٹتی ہوئی پسلیوں کا درد!''

رنگوں سے کھیلنے والی اے عورت شاید تم بھی پہاڑ ندی ہو۔

ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ندی بدن پر پہاڑ نے اپنی مضبوط انگلیوں سے ایک نئی عبارت لکھنے کی کوشش کی ہو، مگر ندی کے باندھ نے اسے روک دیا ہو۔

پینٹری کار کے منیجر نے کافی بھجوادی تھی، اور ساتھ میں کٹ لیٹ بھی۔ زبان خاموش ہوئی ایک نئے ذائقے کے لیے، مگر وہ خاموش کہاں رہنے والی تھی۔

جانتے ہیں سر جی! دواریکا کے پانچ کوؤں کو قریب سے دیکھ کر آئی تو یہاں روحا کنواں مل گیا۔ شاید سات منزلیں بھی۔ سات طواف کی طرح۔ ایسا ہے سر جی! میرا مطلب ندی پہاڑ۔ وہ ہنسنے لگی۔

''میں بہت زیادہ بولتی ہوں اور زیادہ بولنے والوں کے ساتھ آوازوں کا ایک ہجوم چلتا ہے اور آپ بہت کم بولتے ہیں، ہری دوار آنے والا ہے اور اب آپ کو میرے ساتھ 250 کیلومیٹر کار سے سفر کرنا ہے۔ آپ تیار تو ہیں۔''

''ہاں تیار ہوں.....''

ہری دوار آ چکا تھا اور وہ دونوں کار میں بیٹھ چکے تھے۔ سامنے روشنی میں نہائی ہوئی سڑک تھی، گاؤں کی پگڈنڈی سڑک کی سہیلی بن گئی تھی اور وہ دونوں زندگی کی سڑک پر چلنے والے مسافر۔

وہ سوچنے لگا ہر دن جب وہ آفس سے گھر لوٹتا تو انتظار کرتی ہوئی نگاہیں، زندگی کے گھومتے ہوئے پہیوں کی رفتار بن جانا چاہتی تھیں اور وہ ان نگاہوں کے احترام میں اپنے تھکے ہوئے جسم کے لباس کو کھونٹی پر ٹانگ دیتا اور دھیرے دھیرے وہ، وہ نہیں رہتا جس چہرہ کے ساتھ وہ دفتر میں کچھ دیر پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی پرندوں کی طرح، کھلی فضا میں اُڑنے لگتا، یہ پاکھی من بھی ایک جگہ کہاں رہ پاتا ہے۔

جگمگاتے ہوئے شہر کی چوڑی چھاتی والی سڑک پر کار کی اپنی رفتار تھی اور کار میں سوار ان دونوں کی سوچ وفکر کی ایک الگ رفتار۔ سفر میں ایک طرح کے خیالات کہاں آتے ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر میں جاگتی ہوئی زندگی کا قصہ گھومتے ہوئے پہیوں کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کبھی اس کے ساتھ ایک معصوم سی ننھی سی لڑکی چلا کرتی تھی، ندی کی طرح بہا کرتی تھی، انگلیوں کے پور کو چھوتے ہوئے، جب بھی وہ پہاڑ پر بنے عالیشان محل سے نکلتا وہ ساتھ ہو لیتی اور مٹی بدن کہانی کی طرح زندگی کا آنچل تھام لیتی۔

آج شاید وہ دونوں محل سے دور شہد کی بہتی ہوئی نہروں سے کھیلنے گئی اُس شہزادی کو ڈھونڈنے نکلے تھے، جو بیتی راتوں کے ہراجالے میں موجود ہے۔

وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور کدھر گم ہو گئی؟..... کیا وہ سرسوتی تھی، یا پھر کوئی پہاڑن عورت۔ شہزادی؟

کہیں وہ مندا کنی تو نہیں تھی؟

کچھ چہرے گم ہونے سے پہلے منزل کا پتہ دے جاتے ہیں۔ شاید وہ شہزادی بھی جو مچلتی ہوئی ندی کی طرح تھی، نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے اپنی سہیلی سڑک کو ساری داستان سنا گئی تھی، شاید تبھی سے سڑک اپنے عہد کی تاریخ کی خاموش گواہ بنتی جا رہی ہے۔

قدرت نے اس شہزادی کی فطرت میں ندی کی طرح بہنا لکھا تھا، مگر نئی تہذیب کی پھیلتی ہوئی جڑوں نے اسے سسکنے پر مجبور کر دیا، درخت لگانے کی روایت ختم ہوگئی اور جڑوں کو کریدنے کی نئی روایت کی شروعات ہوگئی۔ پیاسوں کے لیے کنواں کھودنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

وہ دونوں کار میں سوار شہر سے دور پہاڑی علاقے میں آ گئے تھے، قدرت کے بے شمار خوبصورت نظارے نگاہوں کے سامنے تھے، مگر ان پہاڑوں پر بھی انسان کی نظر پڑ گئی تھی اور اس کے مضبوط سینے کو چھلنی کیا جا رہا تھا۔ بارود کی مہک دور سے آ رہی تھی۔ آدمی کی روح پانی سے خالی ہو چکی تھی اور زمین کی سطح پیاسی۔

دور کسی ڈھابے سے سل بٹا پر مسالہ پیسنے کی آواز نے انھیں چونکایا اور بھوک کا احساس بھی دلایا، ڈھابا میں وہ کون ہے جو اتنی رات گئے مشین کو چھوڑ کر پہاڑ کی موسیقی سے جڑ رہا ہے۔ کار کے گھومتے ہوئے پہیے تھم گئے اور وہ دونوں سل بٹا سے آنے والی آوازوں کے قریب پہنچے۔

مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا—

ڈھابا تھا— مگر آدمی کے چہرے ایک بھی موجود نہیں تھے، چولھے تھے، مگر اس میں آگ نہیں، پانی رکھنے کے لیے بڑے بڑے ڈرام تھے، مگر اس میں پانی نہیں، ٹین کی چھتیں تھیں، مگر ایسا لگتا تھا جیسے پچھم کی طرف سے کوئی تیز آندھی آئی اور سب کچھ اڑا کر لے گئی۔

وہ دونوں گھبرانے لگے اور تھوڑا سہم سے بھی گئے، یہ کیسا سفر تھا، جس میں وہ ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھے، دوڑ کر وہ دونوں اپنی کار میں واپس آتے ہیں۔ کار اسٹارٹ ہوتی ہے، مگر یہ کیا؟ آگے کی سڑک ندی میں سما گئی تھی اور پہاڑ روئی کے گالے کی طرح ندی کی طرف لڑھک رہا تھا۔

وہ سڑک جس نے شمال اور جنوب کے فرق کو مٹا دیا تھا آخر کیوں وہ ندی، درخت اور پہاڑ کے ساتھ ہوگئی۔

دونوں نے دیکھا ..... گاؤں کی ساری عورتیں..... زندہ تھیں اور سارے مرد چیختی ہوئی ندی میں خاموش ہو گئے تھے.....آوازیں ہمیشہ کے لیے سو گئی تھیں۔

ایک بیٹی اپنے بابا کی ننگی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی، جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا اور انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ شاید کوئی مرد انگلیوں کو سونے کی انگوٹھیوں کے ساتھ کاٹ کر لے بھاگا تھا۔

یہ لاشیں، یہ کٹی ہوئی انگلیاں کہیں آج کے آدمی کی تو نہیں؟

کار اب تیز رفتار سے اسی طرف جا رہی تھی جہاں سے دونوں نے اس سفر کی شروعات کی تھی۔ بغل والی سیٹ پر ندی جیسی ایک عورت تھی اور ''وہ'' شاید ایک پہاڑ۔ ایک ایسا پہاڑ جس نے ندی بدن کا استحصال کبھی نہیں کیا تھا۔ ندی کو روندنے والے اکثر مرد ہی ہوا کرتے ہیں، تو کیا وہ، مرد نہیں۔ صرف ایک پہاڑ جیسا ہے۔

الگ الگ دشاؤں کے دل دہلا دینے والے مناظر کو دیکھ کر لوٹ آیا تھا جسم پھر سے روح کے قریب۔ جسم پر اب روح کی چادر تھی اور نگاہوں میں پہاڑ ندی عورت۔ ❁❁

ادب میں انداز بیان

''ادب میں انداز بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی ادب اور دوسری تمام تحریروں میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ انداز بیان، تکنیک، فارم، زبان اور بیان کی تمام تر شکلوں پر حاوی ہے۔ اس کی ابتدا اُس لمحہ سے ہوتی ہے جب ہم کسی خاص شے سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اختتام اُس وقت ہوتا ہے جب مصنف اپنے شاہکار پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انداز بیان کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس میں موضوع کا انتخاب، احساس کی شدت، ادبی خلوص، طرز فکر اور تاثیر سے لے کر اظہار تک کسی ایک کو الگ کر دیجئے، انداز بیان کی نشو ونما اور ترتیب کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ یہی موضوع اور طرز بیان نفس مضمون اور اسٹائل کا سنگم ہے۔ ادبی تنقید کی سب سے بڑی غلطیاں ان دونوں کو جدا کرنے ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔''

(ماخوذ از ''ادبی تنقید'' محمد حسن، ص ۱۹)

رحمان شاہی

"Farhat House" New Azimabadi Colony, (West) Sector-D, Street No. 10,
Patna - 800006 (Mob. 9572187319)

جن گھوڑی والا

وہ مر گیا.....

اچانک مر گیا۔

یکا یک اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا اور وہ مر گیا۔

اس کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ ہٹا کٹا اور مسٹنڈا تھا۔ سینہ تان کر چلتا تھا اور ہر وقت اکڑ میں رہتا تھا۔ اس کی آواز بھی سخت اور مہیب تھی، آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ان میں خون بھرا ہوتا تھا، سر کے بال گھنے اور مونچھیں بھی گھنی تھیں اور ان میں بہت سارے چاندی کے تار چمکتے رہتے تھے، وہ چھ فٹ سے کم نہ ہوگا، لمبا تڑنگا۔ کسی سے ان بن ہوتی تو مغلظات ایسے اُگلتا تھا جیسے وہ اس کا تکیہ کلام ہو۔

اس کی عمر پچپن ساٹھ سے کم نہ ہوگی، پھر بھی مضبوط اور طاقتور تھا، نڈر بھی خوب تھا اور پھرتیلا ایسا تھا جیسے اس کے اندر چیتا گھسا بیٹھا ہو۔ دشمنوں پر ببر شیر کی طرح غراتا تھا، سارے علاقے پر اس کی دھاک تھی، جدھر سے گزرتا لوگ اس کو سلام ٹھوکنا نہیں بھولتے تھے اور جب غصہ آتا تو لگتا تھا جیسے وہ سامنے والے کو پل میں چیر پھاڑ دے گا۔ اس سے لوگ تھر تھر کانپتے تھے، آس پاس کے شہدے بھی پناہ مانگتے تھے۔

سرور کا کہنا تھا کہ اس نے آج تک کسی کا قتل نہیں کیا۔ کسی کو چھرا چاقو بھی نہیں گھونپا نہ لاٹھی ڈنڈے سے پٹائی کی، پھر بھی لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ بس اپنے سخت چہرہ، سرخ آنکھوں اور اپنی گرج دار اور کرخت آواز سے ہی لوگوں کے پسینے چھڑا دیتا تھا۔

مجھے سرور کی باتوں پر یقین نہیں تھا، مجھے لگتا تھا، وہ چھپا رستم ہے۔ بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی صاف بچ جانے کا ہنر وہ جانتا تھا، شاطر تھا، لوگوں سے ملتا جلتا نہ تھا۔

ہم جس اپارٹمنٹ میں رہتے تھے، اس میں کل چھ فلیٹ تھے۔ ان میں نوکر پیشہ لوگ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ پتا نہیں وہ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہتے تھے یا سکون و آرام سے، ان سے بھی اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی، خشک دماغ تھا، بے مروت، کسی پر مہربانی کرنا یا کسی کی مدد کرنا تو وہ جانتا ہی نہیں تھا، ہنستا تھا، نہ مسکراتا تھا۔

سچ کہتا ہوں، آپ یقین کریں، میں نے آج تک اس جیسا کھڑوس آدمی نہیں دیکھا تھا اور نہ ایسے کسی شخص سے کبھی میرا سامنا ہوا تھا۔ مجھے بس اپنی بہو کی فکر کھائے جاتی تھی اور میں بار بار سرور سے کہتا تھا کہ بیٹا! تم اپنے فلیٹ کو کرایہ پر لگا دو اور بہو کو لے کر کسی اچھی سوسائٹی یا محلّہ میں شفٹ کر جاؤ۔ اس غنڈے موالی کے بیچ بہو کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔ کبھی بھی کوئی اَن ہونی ہو سکتی ہے، لیکن وہ میری بات ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ کہتا تھا کہ ہونے کو تو کہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں رہتے۔

آج کے بچوں کو کچھ سمجھانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ میں چپی سادھ لیتا تھا۔

ایک بار میرا واسطہ حجن میاں سے پڑا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ میں فلیٹ کے نیچے گیٹ سے سٹے کال بیل کو دبا کر بہو کو بالکونی میں بلا رہا تھا اور وہ دور کھڑا مجھے عجیب نظروں گھور رہا تھا۔ دو چار بار کال بیل دبانے پر بھی جب بہو بالکونی میں نہیں آئی تو حجن میاں لپک کر میرے پاس آیا اور ڈپٹ کر بولا تھا: ''کاہے کو بار بار بٹن دبائے جا رہا ہے؟ اوپر کیوں نہیں چلا جاتا.....''

اس کی آواز تھی یا کسی خونخوار چیتے کی غراہٹ میں ڈر گیا تھا۔

''بات یہ ہے کہ.....''

میں نے اس سے کچھ کہنا چاہا، لیکن وہ میری بات کاٹتے ہوئے پھر غرایا تھا۔

''کیا بات ہے..... آئیں..... تماشا نہ کر..... سیڑھیاں چڑھ اور اوپر جا.....''

اس کا لہجہ ہتک آمیز تھا۔ جی میں آئی کہ کچھ بولوں، لیکن اس کا ہاؤ بھاؤ دیکھ کر میری ہمت نہ ہوئی اور میں چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا تھا۔

اسی وقت مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ آدمی خوں خوار ہی نہیں نہایت بدتمیز بھی ہے۔ اس کی لال لال آنکھیں بہت ڈراؤنی تھیں اور اس کی گھنی کچی پکی مونچھیں یوں یوں کانپ رہی تھیں۔ میرا کلیجہ دھل گیا تھا۔

شاید میرا بار بار کال بیل کا دبانا اس کو ناگوار گزرا تھا اور اس کے غصے کا سبب بنا تھا۔

اس کے بعد کئی بار میرا سامنا اس سے ہوا تھا، لیکن اس نے کبھی بھی مجھے بھاؤ نہیں دیا تھا۔ ایک بار جب سرور نے میری ملاقات اس سے کرائی تو وہ میری طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھے بغیر بولا تھا:

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... اپنے باپ کو بول دے .....وہ اپنی حد میں رہے۔''

میں نے سرور سے پوچھا تھا، بیٹا میں نے کون سی اپنی حد پار کی تھی۔ سرور بولا تھا، میں جانتا ہوں پاپا، لیکن اس سے منھ کون لگے۔ خواہ مخواہ حجت کرنے اور موٹی موٹی گالیاں دینے کے سوا اس کو آتا ہی کیا ہے۔ اس کی نظر میں اچھے بھلے عزت دار اور باحیثیت آدمی کی کوئی قدر نہیں، کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ایسا ہی ہے۔

اس کے بعد پھر کبھی میں نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آتے جاتے کبھی نظریں ملتیں بھی تو میں خود ہی کنی کاٹ لیتا تھا۔

شاید اپنے اسی اُجڈ پن کی وجہ کر وہ کسی کو پسند نہیں کرتا تھا اور ہیکڑی کرتا تھا۔ گلی میں کسی کو بھی شور وغل کی اجازت نہیں تھی۔ لوگ خوف کھاتے تھے، سارا علاقہ گنجیڑیوں سے اٹا پڑا ہونے کے باوجود کسی بھی گنجیڑی کی ہمت نہیں تھی جو اس کے گھر کے آس پاس یا گلی میں بھٹک جائے۔ اوباش چھوکروں کا داخلہ بھی گلی میں ممنوع تھا۔ لچے لفنگوں کی بھی کیا مجال تھی جو وہ اس کے سامنے آجائے۔ سب دبکے پھرتے تھے۔

وہ بھیڑ بھاڑ سے دور رہتا تھا۔ اس نے دوست یار بھی نہیں بنایا تھا، بس ایک مالشیا تھا جو دن رات اس کے ساتھ رہتا اور روز رات میں اس کو اصلی سرسوں کا تیل مالش کرتا تھا، دوسرا اس کی بگھی کا کوچوان تھا، وہ اس کی بگھی ہانکتا تھا، اس کے پاس دو سفید خوبصورت گھوڑیاں تھیں اور ایک بگھی۔

سارے شہر میں وہ حجن گھوڑی والا کے نام سے بھی مشہور تھا۔ شہر کے بڑے بڑے لوگوں کے یہاں شادی بیاہ میں اس کی بگھی کرایے پر جاتی تھی۔ جس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر میں نے ایک بار سرور کو کہا تھا کہ وہ چھپ چھپا کر کوئی ناجائز دھندہ ضرور کرتا ہے، جبھی تو روپے کی فراوانی ہے، سرور ہنس کر بولا تھا، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ساری آمدنی بگھی سے ہوتی ہے۔

ایک بار میں ایک لاکھ سے ایک لاکھ بیس ہزار تک میں اس کی بگھی بک ہوتی ہے اور برسات کا موسم چھوڑ کر باقی دنوں میں بک رہتی ہے۔ آج شادی کی کوئی تقریب تو کہیں ختنہ کی دھوم دھام۔ اس کی بگھی ہر جگہ نظر آجاتی تھی۔ اس کی بگھی پر بارات لے جانا لوگ اپنی شان سمجھتے تھے۔ گھوڑیاں سجی سنوری رہتی تھیں، گھوڑیوں کو اور اس کی بگھی کو اور اس کے کوچوان کو سجانے سنوارنے کے لئے پرانی مالن آتی تھی۔ کوچوان کو پگڑی وہ خود باندھتا تھا۔

اس کی بگھی پر جب کوئی بارات نکلتی تو لوگ گلی یا سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو کر خوب نہارتے تھے۔ بچے تالیاں بجا بجا کر اپنی دلی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ گھوڑیوں کی چال بھی بڑی مست ہوتی تھی۔ لوگ دولہے اور شہ بالے کی جگہ بگھی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اس وقت خود حجن میاں بھی دیکھنے کی چیز ہوتا تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ ہنستا تھا نہ مسکراتا تھا، لیکن جب بگھی سج سنور کر روانگی کے لئے تیار ہوتی تو اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی آسودگی نمایاں ہوتی تھی۔ آپ دیکھتے تو بے ساختہ کہہ بیٹھتے کہ یہ وہی کھڑوس حجن میاں تو نہیں ہو سکتا۔ وہ طمانیت اور شان کی ملی جلی علامت نظر آتا تھا۔

آج وہ مر گیا ——

وہ اپنے بڑے بیٹے سجن کے ساتھ موٹر بائیک کے پیچھے ہاتھ باندھے

آرام سے بیٹھا کہیں جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے کی طرف جھکا اور گر کر مر گیا۔ سجن کو تو تب پتا چلا جب راہ گیروں نے چیخ کر کہا:

''ارے.....ارے.....ارے..... حجن میاں گر گیا۔''اور

سجن نے کچھ دوری پر بائیک روک پلٹ کر دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے، پھر وہ بائیک چھوڑ کر دوڑا اور حجن میاں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ مرا پڑا ہے۔ حجن میاں کا منھ کھلا ہوا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے کس کر اپنا سینہ پکڑے ہوئے تھا۔ شاید سینے میں درد اُٹھا تھا۔ ہاٹ اٹیک آیا تھا، اسپتال میں ڈاکٹر نے دیکھا تو فوراً کہہ دیا، حجن میاں نہیں رہے۔

حجن میاں کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دور دور تک پھیل گئی۔ مجھے تو تب پتا چلا جب میں نے رونے دھونے کی آوازیں سنیں اور بالکونی میں آ کر دیکھا۔ سامنے چھ فٹ لمبا تڑنگا حجن میاں چاروں شانے چت اپنے دروازے کے سامنے زمین پر مرا پڑا تھا۔ اس کا منھ ابھی بھی کھلا تھا اور آنکھیں آسمان میں ٹنگی تھیں اور دونوں ہاتھ سینے کو پکڑے ہوئے تھا۔ جبھی پیچھے سے میری بہو آ گئی اور جیسے ہی اس کی نظر سامنے حجن میاں کی لاش پر پڑی، وہ حیران و پریشان سی بولی:

''حجن میاں مر گئے.....آہ بے چارہ.....بے چارہ حجن میاں .....مر گئے.....''

بہو کے دکھ اور افسوس سے بھرے لہجے میں نہ جانے وہ کون سا درد چھپا تھا جس نے مجھے بھی بے کل کر دیا تھا۔ میں نے پلٹ کر بہو کو دیکھا ـــــ اس کے چہرے پر غم اور آنکھوں میں عجیب سی بے بسی تلملا رہی تھی۔ شاید اسے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، شاید آج پہلی بار میں نے حجن میاں کے لئے لفظ بے چارہ سنا تھا، لیکن اس وقت میں نے بہو سے کچھ نہیں کہا۔ پلٹ کر اندر آیا اور صوفے پر دھنس گیا۔ میرے کانوں میں بہو کی آواز بار بار گونج رہی تھی:

''آہ بے چارہ حجن میاں بے چارہ.....مر گئے.....''

حجن میاں کی موت سے مجھے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ شاید علاقہ کے اور لوگوں نے بھی راحت کی سانس لی ہوگی۔

حجن میاں کے جنازے کو دیکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دور دراز سے کثیر تعداد میں لوگ اپنا رنجیدہ چہرہ لئے آئے تھے۔ علاقے کے چور، اچکے، بدمعاش اور گنجیڑی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ٹپوریوں کی ایک پوری ٹولی بھی پہنچی ہوئی تھی۔ سامنے والا وہ فوجی بھی آیا تھا جس کو کل رات حجن میاں نے ٹھراپی کر خوب گلیایا تھا اور بھرپور ٹھکائی کی دھمکی دی تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کا جنازہ اُٹھا اور اسے پاس والے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

جنازے میں بھی بڑی تعداد میں مقامی اور غیر مقامی لوگ شامل ہوئے تھے۔ سبھوں کا چہرہ افسردہ تھا۔ میرا دل جنازے میں شامل ہونے کا نہیں کیا تھا، لیکن بہو نے بہت ضد کر کے بھیجا تھا۔ سرور شہر سے باہر تھا، وہ رہتا تو وہ بھی یقیناً شامل ہو جاتا۔

حجن میاں کی موت کے بعد علاقے کا ماحول بالکل بدل گیا تھا۔ اب کہیں خوف تھا، نہ پراسرار خاموشی تھی۔ اس بارے میں گلی کے اشراف کی ملی جلی رائے تھی۔ کچھ نے حجن میاں کی موت پر دبی زبان میں خوشی کا اظہار کیا تھا، مگر کچھ لوگوں کو ملال بھی تھا۔ بہت سوں نے کھل کر کہا تھا کہ وہ اجڈ ضرور تھا، لیکن ہمیں تو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ البتہ گنجیڑیوں اور جتنے بھی دو نمبر کے لوگ تھے، وہ بہت خوش تھے۔

اوباش لونڈوں کو تو گویا ہڑدنگ مچانے کی کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ وہ بغیر روک ٹوک اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے تھے۔ کوئی منع کرنے والا نہیں تھا۔ اب تو منچلے لڑکیوں پر پھبتی بھی کسنے لگے تھے۔ گنجیڑیوں کی بھی چلتی ہوگئی تھی اور آس پاس کے جو شہدے اور موالی تھے، وہ بھی بنا خوف اپنا سکہ بٹھانے لگے تھے۔ اب کسی طرح کا کوئی خوف تھا، نہ ڈر۔ پورے علاقے میں چہل پہل، شور وغل، اچھل کود اور موج مستی کا ماحول تھا، پھر ایک دن دو گنجڑیوں میں کہا سنی ہوگئی۔ مغلظات کی جھڑی لگ گئی۔ ایک سے بڑھ کر ایک نایاب گالیاں اچھالی جا رہی تھیں۔ روکنے ٹوکنے والا ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔

نشے میں دھت گنجیڑیوں کو ایک دوسرے سے الجھتے اور گالی گلوچ کرتے آپ دیکھ لیں تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کے آپ کو مزہ نہیں تو غصہ بھی نہیں آئے گا۔ کوئی گنجیڑی ہوا میں تمنچہ لہراتا ہوا آسمان میں چھید کرنے کا دعویٰ باندھ رہا تھا اور کوئی حجن

میاں مرحوم کی گھوڑی پر بیٹھ کر چاند کے سفر کی نمائش کر رہا تھا۔ گویا اب حجن میاں کی گلی تماشا گاہ میں بدل گئی تھی۔

ہفتہ بعد ایک اور حادثہ ہو گیا۔ سامنے فوجی کے فلیٹ کے نیچے سے کلال کی چودہ سال کی بیٹی کو کوئی اُٹھا کر لے گیا، جس کو لے کر سارے علاقہ میں ہنگامہ برپا تھا۔ ابھی یہ معاملہ تھما بھی نہیں تھا کہ ایک رات ایک غریب چوڑی ہارے کو اندھیرے میں چکو مار کر کسی نے قتل کر دیا اور فرار ہو گیا۔

اب تو حالت یہ تھی کہ آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ ہو ہی جاتا تھا، لیکن میں بد دل نہیں تھا نہ خوف زدہ ہی تھا، کیونکہ میرے اپنے شہر اور کالونی میں بھی روز ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے اور میں ان کا عادی سا ہو گیا تھا۔ البتہ سرور اور بہو بہت گھبرائے ہوئے تھے اور خوف زدہ بھی تھے۔ میں نے دونوں کو سمجھایا تھا، پولیس نے مورچہ سنبھالا ہوا ہے، کئی لوگوں کی گرفتاری بھی ہوئی ہے۔ تم لوگوں کو اس طرح کے حادثات و واقعات سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہوا کے جھوکوں کی طرح آتے اور چلے جاتے ہیں۔ ان کا سامنا کرو۔ بدترین حالات سے جوجھنا بزدلی نہیں، ان کا شکار ہونا اور چپ بیٹھ جانا بزدلی ہے۔ تم لوگ چوکس رہو اور ضرورت پڑنے پر قانون کی مدد لو۔

میں انہیں سمجھا بجھا کر چھوٹے بیٹے سیف سے ملنے پالیکا نگر چلا گیا اور رات وہیں گزاری، پھر دوسرے دن صبح سویرے سرور کے یہاں لوٹ آیا۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ گھر کا سارا سامان سمیٹا ہوا ہے اور سرور ابھی دفتر سے نہیں لوٹا تھا۔ میں نے بہو سے پوچھا:

''بیٹا، کہیں جانے کی تیاری ہے کیا.....؟''

بہو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی یا پھر سوچنے کا سوانگ بھر رہی تھی، جو بھی ہو مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ میں نے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور شانت ہو رہا۔

چند لمحات بڑی خاموشی میں گزر گئے، پھر بہو بولی:

''میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں۔''

اور لپک کر کچن میں چلی گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ سرور گھر میں داخل ہوتے ہی بہو سے بولا:

''میں نے پالیکا نگر میں ایک فلیٹ لے لیا ہے۔ سیف جہاں رہتا ہے اس کے ٹھیک سامنے والا۔ کرایہ بھی مناسب ہے۔ کل دس گیارہ بجے ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔''

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے بہو کو دیکھا تو وہ بجھی بجھی اور اداس تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی خوف بھی تھا۔

دوسرے دن فلیٹ سے نکلتے وقت میں نے سرور سے پوچھا:

''تم لوگوں نے یہ اچانک کیسا فیصلہ لے لیا۔ اب اس کی ضرورت کیا تھی؟''

''یہ آپ نہیں سمجھیں گے.....'' سرور بولا ''یہ آپ کا نہیں ہمارا شہر ہے۔ یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا.....'' میری آنکھیں بہو پر ٹکی تھیں۔ دفعتاً وہ بولی:

''اب یہ جگہ محفوظ نہیں رہی پاپا.....کل ایک گنجیڑی سیڑیاں چڑھ کر زور زور سے دروازہ ہلا رہا تھا۔ میں تو ایک دم ڈر گئی تھی۔ دروازہ کمزور ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا.....'' اس کی آواز میں درد تھا، تھوڑا سا خوف اور تھوڑی سی گھبراہٹ بھی تھی۔

سرور بولا: ''پاپا، پچھلے دس پندرہ برسوں میں ایک سیڑھی بھی چڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی، لیکن کل تو حد ہو گئی۔''

میں نے پوچھا: ''تم نے پولیس کو رپورٹ لکھوائی.....؟''

''یہ آپ کیا پولیس پولیس کی رٹ لگائے رہتے ہیں.....''

سرور جلبلا کر بولا:

''نیچے پولیس موجود تھی، پھر بھی گنجیڑی اوپر چلا آیا.....''

سرور غصے میں تھا اور اس پر جھنجلاہٹ بھی طاری تھی۔

میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ چپی سادھ لی۔

بہو بولی: ''پاپا، جب تک وہ زندہ تھے ہم لوگ محفوظ تھے۔''

''بیٹا، تم کس کی بات کر رہی ہو.....؟''

''حجن میاں کی پاپا.....'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

میں دم بخود بہو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ افسردہ تھی۔ مجھے نہیں پتا، اس کو فلیٹ چھوڑنے کا ملال تھا یا حجن میاں کے گزر جانے کا غم۔ وہ دوپٹے سے اپنی آنکھوں کے آنسو پوچھ رہی تھی۔ ❁❁

نوشاد عاطر

Associate Prof. Dept. of Urdu, B.N.College, Patna - 800004 (Mob. 8521007768)

موڑ

یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب میں کلاس میں نیا نیا تھا۔ میری جماعت میں زیادہ لڑکے نہیں تھے، یہی کوئی دس بارہ، شاید دو لڑکیاں بھی تھیں۔

اب چہرے تو یاد نہیں، ایک دھند ہے، پرچھائیاں ہیں، کوئی چہرہ روشن ہوتا ہے پھر یادوں کے کہرے میں گم ہو جاتا ہے۔ ایک خوشبو ہے جو کبھی کبھی روح کی پنہائی میں بکھر جاتی ہے، ابر ہے جو دل کے کوہساروں میں کروٹیں لینے لگتا ہے، پھر وہی دھند، وہی پرچھائیں، وہی سایہ۔ ایسا لگتا ہے آسمان کی بلندیوں میں کوئی پرندہ پرواز کر رہا ہو، جیسے جیسے نگاہیں تعاقب کرتی جاتی ہیں ویسے ویسے وہ دور ہوتے ہوتے ایک نکتہ بن جاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتا ہے، لیکن کسی کسی کا نقش دل پر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ آپ چاہ کر بھی بھول نہیں سکتے۔

''کون ہے وہ.....؟'' اسلم نے کہا:

''ایم۔اے میں تھی؟''

''دیکھنے میں کیسی تھی؟''

''یاد نہیں.....''

''پڑھنے میں کیسی تھی؟''

''کچھ بھی یاد نہیں۔''

''تو آخر کیا یاد ہے؟''

''بس اتنا یاد ہے کہ وہ ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور میں تیز تیز چل رہی تھی، یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں۔ میں چھٹی بتا کر سیدھا شعبہ میں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا.....دیکھو بکر.....اسے نہیں ملنی چاہئے۔ میں مقابلہ میں نہیں بیٹھ رہی ہوں۔ کسی بھی صورت میں اسکالر شپ تمہیں ملنی چاہئے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟'' اسلم نے پوچھا:

''کیا ہوتا.....وہی ہوا جو وہ چاہ رہی تھی، اریبہ کو اسکالرشپ نہیں ملی، مجھے اور زین کو ملی۔ سبھوں نے مبارک باد دی۔ وہ بہت خوش تھی، جیسے اسکالرشپ مجھے نہیں اسے ملی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ اس نے باری باری سے سبھوں کو مٹھائی پیش کی، مگر جب وہ اریبہ کے پاس پہنچی۔ تو وہ غصہ سے بپھر گئی، ایسا لگا وہ نکہت کو کچا چبا جائے گی۔ ردعمل کے طور پر نکہت نے آدھی مٹھائی کھائی اور بقیہ اپنے ہاتھوں سے میرے منھ میں ڈال دی۔ اریبہ پیر پٹکتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

منظر پھر دھندلانے لگے.....

اسلم نے کافی میری طرف بڑھائی۔ آتش دان میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ شکریہ کہتے ہوئے میں نے پہلو بدلا۔

احساس و تخیل کی دھنک آسمان دل پر روشن تھی۔ مجھے یاد ہے وہ فروری کا مہینہ تھا۔ چاروں طرف سرخ پھول ہی پھول تھے، برفیلی ہوائیں جسم کو مس کر رہی تھیں۔

میں کینٹین میں بیٹھا چائے اور موسم کا مزہ لے رہا تھا کہ کسی کی تیز آواز سماعت سے ٹکرائی۔ زین کہہ رہا تھا:

''ابے! تجھے ہر وقت چائے کی سوجھتی ہے۔''

''کیا ہوا.....؟'' میں ہڑبڑا کر اٹھا۔

''پتہ ہے وہاں کیا ہو گیا؟'' اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''نوٹس آئی ہے، تیری اسکالرشپ اریبہ کے نام ہو گئی۔''

''یہ کیسے ہو گیا.....؟ Previous میں میرے تو چاروں پرچے کلیئر ہیں.....''

ہم بھاگے بھاگے ڈیپارٹمنٹ پہنچے، دیکھا کہ نکہت چیئرمین سے بحث کر رہی ہے۔

''تم اس کی اتنی طرف داری کیوں کر رہی ہو؟''

''کیوں نہ کروں سر......! آخر وہ میرا کلاس میٹ ہے......

وہ میرا دوست ہے۔''

بہر حال اس نے چیئر مین کو قائل کر ہی لیا، جیسے اسے ازلی سکون مل گیا ہو۔

میری آنکھیں ڈب ڈبا گئیں، پھر وہی دھند وہی پرچھائیاں۔

رات بھیگ رہی تھی۔سکوت کا عالم تھا۔اسلم اونگھ رہا تھا۔اچانک برتنوں کے گرنے سے خاموشی بکھر گئی۔

''شاید بلی ہے۔''میں نے سوچا۔

اسلم نے چونکتے ہوئے پوچھا:''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ابلق وقت ازل سے ابد تک کا سفر طے کرتا رہا۔ ملنا، بچھڑنا، نظام قدرت ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں۔''

''کیا فلسفہ جھاڑتے ہو......آگے تو بتاؤ؟''

آگے کیا بتاؤں، میں اپنے دماغ پر زور دینے لگا......پھر وہی دھند، وہی پرچھائیاں۔

''یار اسلم......ایک ایک کپ اور ہو جائے۔''اچانک اسے فیض کی نظم ''تنہائی'' یاد آ گئی۔

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

یونیورسیٹی کی روایت تھی کہ اپنے کلاس میٹ کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات ایک دوسرے کی ڈائری میں تحریر کئے جاتے تھے۔نکہت فائنلی جا رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کی جھنڈ میں شعبے کے دروازے کے پاس اپنی ڈائری لیے کھڑی تھی۔

''باقی لوگوں کو بھی بلا لو!'' نکہت نے کہا۔

میں انہیں ڈھونڈتا ہوا فیکلٹی کے باہر لائبریری کے گیٹ تک پہنچا:

''زین چلو۔وہ بلا رہی ہے''میں نے کہا۔

''تم بڑھو، میں ابھی آیا۔''

جیسے جیسے بچھڑنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔گزرے ہوئے دن پل پل یاد آ رہے تھے۔ ہماری شرارتیں، ہماری چشمکیں، نوک جھونک، مشاعرے، شکست دل کا مزہ، کسی پہ جان نچھاور کرنے کا جنون ......میں سوچتا ہوا ڈپارٹمنٹ پہنچا۔

''ارے! یہ کیا؟......کہاں گئیں سب؟''

کوریڈور میں نظریں دوڑائیں، سمینار لائبریری میں دیکھا، تمام پروفیسرز کے کمرے میں دیکھا......کہیں نہیں......ابھی تو یہیں تھی، کہاں گئی......؟ جلدی جلدی فیکلٹی کے چاروں طرف دیکھا......وہاں بھی نہیں......تیز تیز لائبریری پہنچا، اوپر نیچے اندر باہر......تمام چھان مارا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔شاید سنٹرل کینٹین میں ہو، لیکن نہیں، میں تھک گیا۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''اسلم نے پوچھا۔

''آہ پھر وقت تھم گیا، پاؤں جم گئے، زمین چپ، آسمان بیگانہ، میں بے کسی کے عالم میں خلاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔احساس کے اس موڑ پر کھڑے کھڑے دہائیاں بیت گئیں اور......اور......'' ❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان وادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ازراہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔شکریہ!

انشائیہ

جہانگیر انس
At. Ranipur, P.o. Barharia, Dist - Siwan - 841232 (Mob. 9162357830)

ڈگری نامہ

پہلے انسان اپنے کردار اور ذہنی صلاحیت کے ذریعہ سماج میں سرخروئی، سرفرازی اور سربلندی حاصل کرتا تھا، لیکن گردش ایام نے یا کسی دیوانے نے ان چیزوں کو درکنار کرتے ہوئے ڈگری کو اعلیٰ صلاحیت اور کردار کا معیار بتادیا، جس کا نتیجہ ہوا کہ لوگ ڈگری کے پیچھے اس طرح بھاگنے لگے جیسے کھلا سانڈ لال رنگ کے پیچھے بھاگتا ہے۔

ہمارے ایک دوست سماج میں کچھ خوش قسمت ڈگری یافتوں کی پزیرائی اور ان کی لگژری زندگی دیکھ کر ڈگری کے اس طرح دیوانہ ہوئے کہ اپنی نصف زندگی ڈگری حاصل کرنے میں گزار دی اور مختلف اداروں سے قسم قسم کی ڈگریاں حاصل کر کے سرکاری محکموں اور یونیورسیٹیوں کے چکر کاٹنے لگے، تاکہ جلد سے جلد کسی اچھے عہدہ پر فائز ہوکر سماج میں سربلند ہوسکیں اور لگژری لائف کا لطف اُٹھا سکیں، لیکن جس ادارے میں گئے وہاں ''نو ویکینسی'' کا بورڈ ان کا منھ چڑھاتا نظر آیا۔

وہ اُن اداروں میں بھی گئے جہاں سے ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ کہیں پزیرائی بھی ہوئی تو ان کی ڈگریوں کی تعداد دیکھ کر ان کی ڈگریوں پر ہی نہیں، ان کی ذہنی صلاحیت پر بھی شبہ کیا گیا، یہاں تک کہ ان اداروں میں بھی ان کی ڈگریوں پر شبہ کیا گیا جن اداروں سے انہوں نے ڈگریاں حاصل کی تھی۔ ان کی ڈگریوں کو جانچ مشین میں اتنی مرتبہ ڈالا گیا کہ ان کا رنگ اڑنے لگا اور انہیں پڑھنے کے لئے میگنی فائن گلاس کی ضرورت پڑنے لگی۔ ڈگریوں کا رنگ اڑنے کے ساتھ ان کے چہرے اور خواب کا بھی رنگ اُڑتا گیا۔ ایک دن وہ اپنی ڈگریوں سے اتنے بددل ہوگئے کہ انہیں جلانے پر آمادہ ہوگئے۔ جیسے ہی انہوں نے تیلی جلائی، میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

''اب دوسری غلطی مت کرو۔''

انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا اور سوال کیا:

''دوسری غلطی کا کیا مطلب ہے؟''

میں نے کہا: ''تمہاری پہلی غلطی ان بہت سی ڈگریوں کا حاصل کرنا ہے۔ کس بیوقوف نے اتنی ڈگریاں حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر تم نے یہ ڈگریاں کردار سازی، تربیت، شخصیت کو نکھارنے اور انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے حاصل کی ہیں تو میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں، لیکن اس کا مقصد نوکری حاصل کرنا ہے، تو بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ جانتے ہو آج کے دور میں ڈگریوں کی کیا حقیقت اور حیثیت ہے؟ آج ان کی حقیقت اور حیثیت تعلیمی اخراجات کی رسیدوں سے زیادہ نہیں۔ ان کا دو ہی مصرف رہ گیا ہے۔ اپنے گھر کی دیوار پر ٹانگ کر خوش ہونا یا شادی میں مرضی کے مطابق جہیز حاصل کرنا، اس کے علاوہ "Nothing" یعنی کوئی اور مصرف نہیں رہ گیا ہے۔ اگر تمہیں ڈگریاں حاصل کرنے کا بہت زیادہ شوق تھا تو 'ڈگری منڈی' میں چلے جاتے اور چند سکوں میں اپنی من پسند ڈگری حاصل کر لیتے۔''

ذرا رک کر میں نے پھر کہا:

''اب اگر تمہیں اپنی ڈگریوں کو بے مصرف سمجھ کر جلانے کا شوق پیدا ہوگیا ہے تو اسے خاموشی سے جلانے سے کیا فائدہ۔ اس کے لئے باقاعدہ ایک تقریب منعقد کرو کہ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے اور ہولیکا دہن کی طرح ''ڈگری دہن'' بھی ایک تقریب بن جائے۔

میری بات سن کر اس نے کہا:

''کیوں جلے پر نمک چھڑکتے ہو، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ 'ڈگری منڈی' بھی ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو اپنی زندگی کے سنہرے دور کو یوں برباد نہ کرتا، لیکن مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ کہیں ڈگری منڈی بھی ہوگی۔''

میں نے کہا: ''میری باتوں پر تمہیں یقین نہیں آرہا ہے تو

واقعی تم نہایت بھولے ہو اور بھولا ہونے کا معنی تم جانتے ہی ہو۔ آج ساری دنیا ایک بازار بن گئی ہے۔ یہاں ہر شئے بکاؤ ہے۔ اگر جیب میں پیسہ ہے تو کیا کچھ نہیں خریدا جاسکتا۔ عزت، آبرو، ایمان داری، وفاداری، سب کچھ برائے فروخت موجود ہے۔

چاول منڈی، دال منڈی، تیل منڈی، گڑ منڈی، کپڑا منڈی، بکرا منڈی کی طرح ''ڈگری منڈی'' بھی آج کی ایک حقیقت ہے، ان تمام قسم کی منڈیوں میں ''ڈگری منڈی'' کا ستارہ سب سے عروج پر ہے، ''ڈگری منڈی'' کو جو مقبولیت حاصل ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس منڈی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے فرنچائیز ز ہر شہر میں موجود ہیں۔ کچھ نادیدہ ہاتھ بھی ہیں جو اعلیٰ پیمانے پر اس کاروبار سے منسلک ہیں۔

ڈگری فروشی کا کاروبار نیا نہیں ہے۔ پہلے یہ کاروبار گانجا، افیم، چرس اور دیگر نشہ آور چیزوں کی طرح چھپ چھپا کر چلتا تھا اور عام لوگ وہاں تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ خاص طور سے خاص لوگ ہی اس سے استفادہ حاصل کرتے تھے، مگر اب یہ کاروبار کھلے عام چل رہا ہے۔

ڈگری منڈی میں ہر طرح کی ڈگریاں برائے فروخت موجود رہتی ہیں۔ خریدار کی قوت خرید پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کی ڈگری خریدنے کی مالی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس منڈی میں آپ کو جنرل تعلیم سے لے کر پیشہ وارانہ تعلیم تک کی ڈگریاں مل جائیں گی۔ آپ ڈگری خرید کر چپراسی سے لے کر پروفیسر تک اور ڈاکٹر سے لے کر انجینئر تک بن سکتے ہیں۔ یہاں معقول معاوضے پر پی ایچ دی کی ڈگری بھی آپ کی مرضی کے مطابق مل جائے گی۔

ڈگری کی ڈیمانڈ کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اگر چند اداروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو کوئی بھی ادارہ بغیر ڈگری کے کسی کو ملازمت نہیں دیتا۔ دور حال میں ڈگری کی کہانی بھی غضب کی ہے۔ اگر آپ غیر ڈگری یافتہ ہیں تو کوڑی کے تین ہیں اور ڈگری یافتہ ہیں تو کوڑی کے پانچ ہیں۔ غیر ڈگری یافتوں کو ڈگری یافتاؤں پر فوقیت اس لئے حاصل ہے کہ اس کے گھر کا چولہا کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح مزدوری کر کے اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ ڈگری والوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے سے زیادہ اپنے اسٹیٹس کا خیال رہتا ہے، وہ اپنی شرٹ پینٹ کا کلف ٹوٹنے دینا نہیں چاہتے۔ ڈگری کے مطابق نوکری نہ ملنے پر اپنی قسمت اور حکومت کو کوسنے میں ان کا زیادہ وقت گزرتا ہے، گھر میں چوہے ڈنڈ پیلتے رہتے ہیں۔ بیوی اور بچے بھوک سے بلکتے اور سسکتے رہتے ہیں، مگر وہ کوئی معمولی کام اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اتنا پڑھ لکھ کر، اعلیٰ تعلیم کی ڈگری لے کر یہ معمولی کام۔ سناتن شاستر کے مطابق انسان میں چھتیس گن (خوبیاں) ہوتے ہیں۔

علامہ بقراط

☆ کوئی صاحب سفر میں تھے، ایک منزل پر انہیں بارش اور آندھی نے آلیا۔ وہ بیچارے، بہت گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگے کہ کہیں رات بسر کرنے کا ٹھکانہ مل جائے۔ بڑی مشکلوں کے بعد ایک سرائے کے دروازے پر پہنچے۔ رات بہت ہو چکی تھی، بارش اور آندھی کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے اور بستی خالی پڑی تھی۔ بہر حال انہوں نے سرائے کے دروازے پر دستک دی پھر بلند آواز سے پکارا۔ سرائے کا چوکیدار ڈیوڑھی میں پڑا سو رہا تھا۔ نیند ہی کے عالم میں اس نے پوچھا ''کون ہے؟'' انہوں نے جواب دیا! زبدۃ السالکین، عمدۃ الواعظین ،حضرت علامہ حکیم حاجی مولوی ابوالفضل شیخ علام محی الدین چشتی صابری اجمیری ثم مانک پوری.....'' ابھی جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اندر سے آواز آئی ''حضرت معاف فرمایئے اتنے لوگوں کے لئے ہمارے پاس جگہ نہیں ہے۔''

☆ ایک صاحب فضل وکمال کے پاس ایک خادم تھا۔ وہ انہیں صرف مولوی صاحب کہہ کر پکارتا تھا۔ ایک دن موصوف نے برہم ہو کر کہا کہ تمہیں ہمارے مقام ومنصب کا کچھ علم بھی ہے؟ ہماری شان تو انبیائے اسرائیل کی سی ہے۔ ہم عالم دین ہیں اگر ہمیں مخاطب کرنا ہو تو

غیر تعلیم یافتاؤں میں یہ گن منتشر رہتے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی بھی گن کو اپنانے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتے، لیکن تعلیم یافتاؤں کے اندر کے یہ چھتیس گن ان کی ڈگری میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں اس لئے وہ اپنی ڈگری کے مطابق کام نہ ملنے پر بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔

مشہور ہے کہ ایک خاتون کے تین جوانِ لڑکے تھے، لیکن اس کے گھر کی مالی حالت خراب تھی۔ کسی نے سوال کیا:

''تین جوان لڑکوں کے گھر میں یہ بدحالی؟''

خاتون نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:

''بڑے لڑکے کو انجینئرنگ کی ڈگری لئے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔ نوکری ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود سے بھی بیگانہ ہو چکا ہے۔ دوسرے لڑکے نے فزکس میں ایم اے، پی ایچ ڈی کیا ہے۔ اس کو کالجوں اور دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے پانچ سال ہو گئے ہیں وہ بھی نیم بدحواس ہو گیا۔ دونوں بڑے بھائیوں کا حال دیکھ کر چھوٹے بھائی نے پڑھائی سے منھ موڑ لیا۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس کی کمائی سے کسی طرح گھر چلتا ہے.....''

ابھی میں نے یہیں تک لکھا تھا کہ عزیز دوست، مشہور شاعر و ادیب علامہ گرگٹ نے ہاتھ پکڑ لیا اور لعنت ملامت کرنے لگے کہ تم لوگوں کو تعلیم سے بھڑکا رہے ہو اور ڈگری حاصل کرنے سے ڈرا رہے ہو۔

میں نے ان کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا کہ اس مضمون کو لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں لوگوں کو تعلیم اور ڈگری کے حصول سے روکنا چاہتا ہوں بلکہ دور حال میں ڈگری کی جو اہمیت رہ گئی ہے اس کا آئینہ دکھا رہا ہوں، ورنہ ڈگری کی اہمیت میرے نزدیک پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے بس شرط یہ ہے کہ وہ خریدی ہوئی نہیں ہو۔ چراغ ہبلوی نے کتنی اچھی بات کہی ہے ؎

ڈگریاں نہیں کرتیں ، فیصلے فراست کے
تربیت بتا دیتی ہے ، خاندان کیسا ہے

پہلے لوگوں کے پاس تعلیم نہیں تھی تربیت تھی، اب تعلیم ہے ڈگری ہے، تربیت نہیں، پہلے ڈگریاں کم تھیں، لیکن ایمان داری زیادہ تھی، اب ڈگریاں زیادہ ہیں ایمان داری کم ہے، اس لئے ڈگریاں بے مول ہو گئی ہیں اور ہاں! میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ ڈگری حاصل کرنے میں خواتین، مرد حضرات سے ہزار ڈگری آگے ہیں۔ وہ اپنی محنت اور جدوجہد سے ڈگری حاصل کریں یا نہ کریں، وہ قدرتی طور پر ڈگری یافتہ بن جاتی ہیں، اگر وہ کسی ماسٹر کے عقد میں آتی ہیں تو ماسٹرنی کی ڈگری خود بخود مل جاتی ہے اور اسی طرح ڈاکٹر کی بیوی کو ڈاکٹرنی کی ڈگری۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان و ادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

پورے القاب وآداب کے ساتھ بلایا کرو۔ اس کے بعد موصوف نے اپنے القاب ومناصب کی فہرست اُسے ازبر کرادی۔ خادم بڑا چلبلا تھا، اسے یہ طویل فہرست بہت بری لگی۔ اس لمبی چوڑی فہرست سے نجات کے لئے اس نے ایک ترکیب سوچی۔ ایک دن وہ چلم بھر کر لایا اور مولوی صاحب کے عمامے پر آنکھ بچا کر ایک چنگاری ڈال دی۔ عمامہ بہت بھاری تھا اس لئے چنگاری نے ذرا دیر میں آگ پکڑی۔ عمامہ جلنے لگا اور کپڑے کی بو پھیلی تو مولوی صاحب بہت گھبرائے اور پوچھا کہ کیا جل رہا ہے۔ نوکر نے پہلے دونوں ہاتھ باندھے، پھر گلا صاف کیا، پھر سر جھکا کر کہنے لگا: ''جناب فضیلت مآب، آفتاب افلاک علوم اور ماہ افق فنون حضرت مولانا صاحب دامِ برکاتہم وزادالطافکم، ایک شعلہ گستاخ چلم سے اُڑ کر حضور کے عمامہ شریف میں بیٹھ گیا۔ غلام بے دام نے لاکھ کوشش کی کہ چنگاری نکال پھینکے مگر ناکامی ہوئی۔'' اتنے وقت میں عمامہ آدھے سے زیادہ جل گیا اور آنچ تالو تک آ گئی۔ مولوی صاحب نے کہا ''تم بڑے جاہل اور احمق ہو، صاف کہنا چاہئے تھا کہ'' پگڑی میں آگ ہے۔'' (ماخوذ)

منظومات

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

"Noman Manzil" H.No. 4/704, J-24, Hamdard Nagar-B, Jamalpur,
Alighar-202002 (Mob. 9897820777)

نعت پاک

ہماری فہم و خرد کی حد سے ہے بے شک اونچا مقامِ آقا
درود پڑھئے ، سلام پڑھئے جب آئے ہونٹوں پہ نامِ آقا

نگاہیں ہوتی تھیں محو حیرت ، جو سامنے ہوتا روئے حضرت
کہاں مہ و مہر کی شعاعیں ، کہاں جمالِ تمام آقا

ہے یہ حقیقت ، نہیں حکایت ، ہے آپ پر ختم ہر فضیلت
تمام جن و بشر پہ لازم ہے عزت و احترام آقا

جہاں بشر کی نظر نہ پہنچے ، وہاں پہ پڑتے تھے پاؤں اس کے
وہ راہوارِ جہان بالا ، وہ مرکب تیز گامِ آقا

جدھر ، تدھر کیوں بھٹک رہے ہو ، رہِ ہدیٰ سے بہک رہے ہو
قدم کو چومے گی خود ہی منزل ، کرو تو نافذ نظامِ آقا

جو لے کر آئے تھے بابا آدم ، پیامِ توحید اس زمیں پر
جو سمجھو دُنیا میں رہنے والو ، وہی ہے اصلاً پیامِ آقا

جہاں کے سب فلسفوں کو چھوڑو ، مرے عزیزو ، فقط یہ دیکھو
گزرتے تھے اس جہاں میں کیسے نہار و شب ، صبح و شام آقا

خدا کی رحمت تھی ساتھ ان کے ، نظر میں رہتے تھے رب کی ہر دم
سجودِ آقا ، قعودِ آقا ، رکوعِ آقا ، قیامِ آقا

رئیس کی دل سے یہ دعا ہے ، الٰہی تجھ سے یہ التجا ہے
زباں پہ وقت اجل ہو میری ، تری ثنا اور نامِ آقا

❁❁❁

ظفر اقبال ظفر
170, Khildar, Fatehpur - 212601 (U.P.) (Mob. 7379512431)

غزلیں

خنجر کوئی سینے میں اتر جائے تو اچھا
احساس جو زندہ ہے وہ مر جائے تو اچھا

جس خواب کی دنیا میں تعبیر نہیں کوئی
وہ خواب بے دیکھے ہی بکھرجائے تو اچھا

جس شخص کی باتوں میں جادو ہے محبت کا
وہ شخص ذرا دیر ٹھہر جائے تو اچھا

اک عمر تو بے راہ روی میں ہے گزاری
اب آخری لمحہ ہی سنور جائے تو اچھا

ہوتا نہیں ہے جس پہ نصیحت کا اثر کچھ
وہ اپنے ہی اعمال سے ڈر جائے تو اچھا

یہ پھول تو زخموں کا احساس دلاتے ہیں
دامن مرا کانٹوں سے ہی بھر جائے تو اچھا

احساس کی شدت جو بڑھا دیتے ہیں میری
وہ لمحہ نگاہوں سے گزر جائے تو اچھا

خوشبو ہے میسر نہ جسے رنگوں کی بارش
خود اپنے لہو سے وہ نکھر جائے تو اچھا

مدت سے لکھا جس نے ظفر پیاس کا نوحہ
وہ شخص سمندر میں اُتر جائے تو اچھا

❁❁❁

بدن میں جب شرارے ٹوٹتے ہیں
لہو کے استعارے ٹوٹتے ہیں

ڈبو دیتے ہیں ساری بستیاں پھر
کنارے آکے دھارے ٹوٹتے ہیں

فسانے جاگتے ہیں ذہن و دل میں
فلک پر جب ستارے ٹوٹتے ہیں

نہیں رہتا سلامت کوئی منظر
کبھی یوں بھی کنارے ٹوٹتے ہیں

بکھر جاتا ہے وہ اندر ہی اندر
کسی کے جب سہارے ٹوٹتے ہیں

زمیں پر خون بہتا ہے ہمارا
فضا میں رنگ سارے ٹوٹتے ہیں

ظفر ویران ہو جاتی ہیں آنکھیں
نظر سے جب نظارے ٹوٹتے ہیں

❁❁❁

مرغوب آثر فاطمی

Road No.7, Mohalla Aliganj, Gaya - 823001 (Mob. 9431448749)

غزلیں

تھا محبت کو یقیں بیٹھی دریچے رہ گئی
سامنے نفرت کھڑی تلوار کھینچے رہ گئی
عقل مندی کر رہی تھی جوش کا پیچھا مگر
وقت کی رفتار کے آگے وہ پیچھے رہ گئی
رفتہ رفتہ ہی ، ضعیفی نے سفر پورا کیا
نوجوانی تلملاتی آنکھ مینچے رہ گئی
مصلحت کی آبیاری میں رہی مصروفیت
دور اندیشی کی بگیا کون سینچے ، رہ گئی
پھر سر فہرست جلوہ گر تھی کنبہ پروری
اہلیت تھی مستقل خاموش ، نیچے رہ گئی
دشمن جانی کی جانب بڑھ گئے آخر قدم
سرد مہری دوستوں کی مجھ کو بھینچے رہ گئی
روز افزوں دیکھتا ہوں گوند اور قینچی کا کھیل
جملہ سازی سے آثر تخلیق پیچھے رہ گئی

❁❁❁

دماغ سلب ، نظر پست اور نہ لب خالی
خیالِ یار سے ہوتی ہے بزم کب خالی
یہ کارزار ہے ، تدبیر کی کمی بھی نہیں
ہیں بےشعور جو پھرتے ہیں روز وشب خالی
اگر نہ جان پہ بن آتی اپنی بستی میں
مکاں سلف کا وہ کرتا نہ بے سبب خالی
عمل سے دور تو کاوش سے بیر تھا جس کو
رجائیت سے رہی اُس کی تاب وتب خالی
نئے مزاج کے نباض وہ اگر ہوتے
حکیم جھکتے نہ ہوتے کبھی مطب خالی
علوم پیرا ہیں اوروں کے ذہن تازہ کار
ہمارے بچوں میں آلائش طرب خالی
گرے پڑے ہوئے الفاظ ڈھونڈتا ہے آثر
مقامیت سے رہے کیوں بھلا ادب خالی

❁❁❁

اشعار
شوق نیموی

دھڑکتا ہے کلیجہ ، بد گمانی بڑھتی جاتی ہے
سنا ہے آج کل وہ غیر کی محفل میں رہتے ہیں

رُخ سے ترے چمک مرے داغِ جگر کی ہے
داغِ جگر کے عکس سے روشن ہے آفتاب

ہمارا کیا قصور اِس میں جو تم کو پیار کرتے ہیں
حسینوں میں حسیں کیوں ہو، جوانوں میں جواں کیوں ہو

چشم عاشق کے ہوں آنسو کہ کسی کا جوبن
بڑھ چلیں لاکھ ، مگر دونوں ہیں ڈھلنے کے لئے

دل کوئی چرا لے تو نہیں اُس کی شکایت
آنکھیں مگر اے جان چرانا نہیں اچھا

آحمد اورنگ آبادی

C/o S.K. Junaid Ahmed, H.No.- 8-10-159, Yunus Colony, Kat Kat Gate (Islam Darwaza)
Aurangabad, Maharastra - 431001 (Mob. 9028028148)

غزلیں

اُسے لگا تھا کہ نایاب ہوگیا ہے وہ
پر اپنے واسطے ہی خواب ہوگیا ہے وہ

کڑی تھی دھوپ ، مگر بادلوں کے چھٹنے سے
جو بوند بوند تھا سیلاب ہوگیا ہے وہ

زمیں کی پیاس بجھاتے بجھاتے اک دریا
بتا رہا تھا کہ پایاب ہوگیا ہے وہ

وہ جن کے واسطے آبِ حیات لایا تھا
انھیں کے واسطے زہرآب ہوگیا ہے وہ

مصالحت کے سر بزم اشک پی پی کر
وہ ایک صحرا تھا سیراب ہوگیا ہے وہ

مرے عزیز ، اسے اب تلاش مت کرنا
سنا ہے آج سے کمیاب ہوگیا ہے وہ

تو ایک قطرۂ شبنم ، سنبھل سنبھل آحمد
خبر ہے گرم کہ گرداب ہو گیا ہے وہ

❁❁❁

خواب آنسو ہوگئے اور یاد بادل ہوگئی
رات دونوں اتنے برسے آنکھ جل تھل ہوگئی

درد ساحل پر کھڑے تھے ہاتھ میں پتھر لئے
پھر سکوتِ بحر جاں میں ایک ہلچل ہوگئی

رات کے نوحے بھلا کب تک سنیں تنہائیاں
جلد آ اے صبح نو یہ رات پاگل ہوگئی

آئینوں سے کیا کریں ہم کم نگاہی کا گلہ
اپنی صورت اپنی ہی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی

ہے اثاثہ عشق کا عہد وفا کی گٹھریاں
ڈھوتے ڈھوتے زندگی کی پشت بوجھل ہوگئی

چاہتوں کی فصل آحمد کیا اُگائیں ہم بھلا
جو زمیں کی ہم نے نم وہ آج دَلدل ہوگئی

❁❁❁

اشعار زیبا

ملبوس خوش نما ہیں ، مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر (شکیب جلالی)

جو ہوں خود نمائی کے خود ہی شکار
بھلا ایسے لوگوں کا کیا اعتبار (وفا براہی)

وقت کی مانگ میں مانا کہ اندھیرا ہے بہت
وقت کی مانگ میں ہم کوکب شب رکھ دیں گے (وحید مرزا)

میں کس ہوا میں اُڑوں کس فضا میں لہراؤں
دکھوں کے جال ہر اک سو بچھا گیا ایک شخص (عبیداللہ علیم)

طلحہ تابشؔ

Sahuadarpur West, Station Road, Pratapgarh - 230001 (Mob. 9044676517)

غزلیں

تیری غرقابی میں آخر موج کا کیا دوش ہے
موج کو ساحل بنانے کا تجھے کب ہوش ہے

اس سے بڑھ کر اور کہیں کوئی نہیں جائے سکوں
سب سے بہتر، سب سے بڑھ کر ماں کی ہی آغوشی ہے

پر کتر ڈالا سلیقے سے ، مرے صیاد نے
اُڑنے کی قوت نہیں ہے اور زباں خاموش ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اندر سے وہی ہے خستہ حال
دیکھتے آئے ہیں جس کو آج تک خوش پوش ہے

ہے اسی سے دل میں بے چینی کا اک طوفاں بپا
حسن کا جلوہ مری آنکھوں میں جو رُو پوش ہے

دورِ حاضر میں ہے لگتی زندگی بھی اک سزا
کچھ دنوں سے لگ رہا ہے سر بھی بارِ دوش ہے

تھک کے وہ بیٹھا نہیں ہے اور عزائم ہیں جواں
آگے بڑھنے کا ابھی اس میں غضب کا جوش ہے

رنج و غم کا ذکر تابشؔ کی زباں پہ اب نہیں
اس کو حاصل آج کل محبوب کی آغوش ہے

❁❁❁

ہر ایک حال میں وہ مسکرائے جاتا ہے
بڑے سلیقے سے وہ حالِ دل چھپاتا ہے

نصیب سے نہیں پھر بھی ہے اک نشہ طاری
وہ اپنی تشنہ لبی اس طرح چھپاتا ہے

غزل اسی کی سراہی گئی ہے محفل میں
جو فکر و فن کی نئی بستیاں بساتا ہے

بساطِ نور پہ شاید وہ پہلی بار آیا
اسی لئے تو اُجالے سے خوف کھاتا ہے

یہاں بھی رکھتا ہے آداب پر نظر وہ شخص
بڑے سلیقے سے وہ دشمنی نبھاتا ہے

کرے ہے جادو سی اس کی سخنوری لیکن
وہ شہرتوں کی بلندی سے خوف کھاتا ہے

وہ صبر و ضبط کی زندہ مثال ہے تابشؔ
وہ پھول کی طرح کانٹوں میں مسکراتا ہے

❁❁❁

افسر جمال افسؔر

Flat No. 106, Gulzar Apartment, Fedrel Colony Sector - 3, Phulwarisharif, Patna-801505 (Mob. 9631577374)

غزلیں

مطلوب کچھ نہیں ہے تری خاکِ پا کے بعد
آسودگی ملی ہے دعائے شفا کے بعد
دورِ ستم ہے دوستو! افسوس ہے یہی
اک سلسلہ ہے اور بھی اس سانحہ کے بعد
ظالم ، ترے ستم کی حدیں پار ہو چکیں
اب اور کیا بچا ہے تری اس جفا کے بعد؟
یوں آزمائے جاتے رہے ہیں سدا سے ہم
کتنے ہی کربلا ہوئے اک کربلا کے بعد
کوتاہیوں کی اپنی سزا پارہے ہیں ہم
راحت ملے گی دوستو ، لیکن سزا کے بعد
نیت میں تھا فتور مسیحائے وقت کی
بیمار کو ملی نہیں راحت دوا کے بعد
آئے گی فصل بادِ بہاراں بھی ایک دن
یہ ہے یقیں کہ دورِ اذیت فزا کے بعد
کر لے جو کر سکے کہ ترا وقت ہے ابھی
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
رب کے سوا کسی کو پکاریں بھی کیوں بھلا
افسؔر! بتاؤ کون ہے ہستی خدا کے بعد

❁❁❁

سوزش جو دل کی آج تلک تھی دبی ہوئی
نکلی تو حرف بن کے مری شاعری ہوئی
ہر ذرّہ مجھ کو خاکِ وطن کا عزیز ہے
ہے میرے دل میں اس کی محبت بسی ہوئی
بدلے گا اس طرح سے یہ ماحول عنقریب
رہ جائیں گی تمہاری بھی آنکھیں پھٹی ہوئی
سجدہ خدا کا اور بھروسہ بھی غیر پر
تم ہی بتاؤ یہ بھی کوئی بندگی ہوئی ؟
ہم نے جو داستانِ غم دوستاں سنی
لگتا ہے یہ کتاب ہے ، کچھ کچھ پڑھی ہوئی
جو دل میں ہے ہمارے ، وہی ہے زبان پر
یوں ہے کتابِ زیست ہماری کھلی ہوئی
اس زندگی کی اور بھی تفسیر کیا لکھیں
ہے ایک ہی مقام پہ جیسے رکی ہوئی
کوئی کسی کی دوستو ، سنتا نہیں یہاں
ہر آدمی کو آج ہے اپنی پڑی ہوئی
حق بات کا کیا ہے کسی نے جو انکشاف
کیوں کھلبلی ہے چار سو افسؔر مچی ہوئی

❁❁❁

ڈاکٹر شاہد فروغی

C-1/507, Subhash Nagar, Housing Complex, 161, M.J.Road, P.o. Pravash Nagar,
Shriram Pore, Dist. Hooghly - 712249 (West Bengal) (Mob. 9339624245)

غزلیں

سفر تو جاری ہے ، پر راہیں ٹوٹ جاتی ہیں
ہوائیں ، دھول ہر اک ، موڑ پر اُڑاتی ہیں
حسین چہرے پہ غم کا فسانہ روشن ہے
تمہاری آنکھوں میں دو بوندیں جھلملاتی ہیں
پڑے ہوئے ہیں بنا بیڈ کے مریض یہاں
یہ نرسیں اُن کے فسانے ہمیں سناتی ہیں
بہت سے رشتوں کو چھوڑا ہے اپنے گاؤں میں
کہ اُن کی یادیں ہمیں شہر سے بلاتی ہیں
کبھی کبھی یہ زمانے میں ایسا ہوتا ہے
کہ منزلیں بھی یہاں راستے بناتی ہیں
بڑی کسک ہے فروغی ترے فسانے میں
تری کتابیں ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں

وقت کے سائے تلے چلتے رہے راہوں میں
خواب ہنستے رہے ، مٹتے ہی رہے آنکھوں میں
زندگی فکر کے شعلوں سے پگھلتی ہے سدا
آدمی بٹتا ہے ، یاں روز نئے خانوں میں
وہ خدا ایسا ہے ، دنیا میں کہیں بکتا نہیں
سارے مٹی کے خدا بکتے ہیں بازاروں میں
رات وہ کیسے کٹی مجھ کو پتا بھی نہ چلا
میں تو اُلجھا ہی رہا اس کی حسیں باتوں میں
اُس کو آنا تھا مگر ، گھر نہیں آیا میرے
دن مہینے بھی گزرنے لگے ہیں سالوں میں
تیری شہرت کی سند یہ ہے ، فروغی سن لے
لوگ پڑھتے ہیں تجھے شوق سے اخباروں میں

اشعار مشاہیر

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ کی — آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کے (امیر مینائی)
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست — ترے جمال کی دو شیزگی نکھر آئی (فراق)
دیکھنا اچھا نہیں ہے زانو پہ رکھ کے آئینہ — دونوں نازک ہیں نہ رکھ تو آئینہ پہ آئینہ (داغ)
ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں — میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے (جگر)
ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب — ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں (ساحر)
موج طوفاں پہ بھروسہ تو بڑی بات رہی — وقت کہتا ہے کہ ساحل سے بھی ڈرتے رہنا (ساغر اعظمی)
آؤ اس دنیا ہی کو جنت بنا ڈالیں — پھر خدا جانے کہاں جانا ہو مرجانے کے بعد (بیدی سحر)

غزلیں

اصغرؔ شمیم

12/3/H/1, Patwar Bagan Lane, Kolkata - 700009
(West Bengal) (Mob. 9836224948)

ایسا قصہ سنا گیا کوئی
روتے روتے ہنسا گیا کوئی
نیند آتی نہیں ہے راتوں میں
خواب ایسا دکھا گیا کوئی
اس کی جانب میں جا رہا تھا مگر
سامنے میرے آ گیا کوئی
وہ اکیلے میں بات کرتا ہے
اس کو پاگل بنا گیا کوئی
کوئی غم ہے ، نہ ہے پریشانی
جینا مجھ کو سکھا گیا کوئی
میں بھی انسان تھا مگر اصغرؔ
مجھ کو پتھر بنا گیا کوئی

❀❀❀

صابرؔ سہرساوی

At+P.o. Mobarakpur, P.S. Salkhua,
Dist- Saharsa - 852126 (Mob.9939900102)

میں نے احساسِ زیاں خوف کا منظر دیکھا
ظرف کی آنکھ میں لرزہ ہوا تیور دیکھا
جس نے تا عمر کوئی شعر نہ مصرع لکھا
ہم نے اس دور میں ایسا بھی سخنور دیکھا
اب کہاں شہر محبت کی ہے حرمت باقی
سم نفرت سے بھرا شہر میں لشکر دیکھا
زندگی غیر کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر
زر کے محلوں میں اسے زینت بستر دیکھا
ہم نے سمجھا تھا جسے گاؤں کا بہتر انساں
آستینوں میں اسی شخص کے خنجر دیکھا
زہد و تقویٰ کا جسے ناز تھا اپنے اوپر
میں نے اس کو بھی سبو خانے میں اکثر دیکھا
اک ذرا ڈھونڈ کے لاؤ تو بتاؤں صابرؔ
کس نے پتھر کے کلیجے پہ ہے نشتر دیکھا

❀❀❀

اشعارِ دردؔ

دولت فقر کے حضور ، گرد ہے جاہ و سلطنت — کہتے ہیں جس کو یاں ہما ، اپنی نظر میں زاغ ہے
اگر جمعیت دل ہے تجھے منظور ، قانع ہو — کہ اہل حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں
وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ، جو سنا افسانہ تھا
کیا کام مجھے خوف و رجا سے کہ مرے پاس — ہے جان سو بے جان ہے ، دل ہے سوغنی ہے

غزلیں

صدام غنیؔ

Makan - 13, Cross Road No. 3, Azad Nagar, Mango
Jamshedpur - 831012 (Mob. 9631832842)

برا کیا تھا کہ الفت میں ہمیں اِقدام کر لیتے
وہ ہستی جو ہماری تھی، تمہارے نام کر لیتے
تھپیڑے روز و شب کے سہتے سہتے تھک گئے ہیں ہم
کوئی لمحہ جو ملتا پرسکوں ، آرام کر لیتے
ہے جن کا کام نفرت بانٹنا ، وہ بانٹتے جائیں
توقع ان سے بے جا ہے کہ الفت عام کر لیتے
مقامِ عشق دورانِ سفر کوئی تو آ جاتا
ٹھہر کر ہم وہیں اس زندگی کی شام کر لیتے
اگر معلوم ہوتا یہ کہ دنیا میں ہے تنہائی
تو ہم پہلے ہی اپنے آپ کو گمنام کر لیتے
قلم کچھ دیر کی خاطر سہی گر ہاتھ لگ جاتا
کہانی کا ہم اپنی خوشنما انجام کر لیتے

حجابؔ منظر

Maulana Azad National University,
Hyderabad- 500032

موت مانگو مگر نہیں آتی
وقت سے پیشتر نہیں آتی
آدمی تو بہت ہیں دنیا میں
آدمیت نظر نہیں آتی
جم کے بیٹھے ہو راہِ ہستی پر
تم کو یادِ سفر نہیں آتی
دفعتاً ٹوٹتی ہے برقِ اجل
یہ بلا پوچھ کر نہیں آتی
شبِ غم کی سیاہیاں توبہ
صبح ہوتی نظر نہیں آتی
شادمانی کا دور دورہ ہے یہ حجابؔ
بزمِ گل میں مگر نہیں آتی

مقاطع
شوقؔ نیموی

وہ دل دیا ہے خدا نے کہ بعد مرگ شوقؔ
بغیر یار کے حوروں میں بھی بہل نہ سکا
نالہ و آہ کی اک بھیڑ لگی ہے اے شوقؔ
لطف دیتا ہے یہ مجمع شب تنہائی میں
پائیں گے کیا عدو مرا رنگ کلام شوقؔ
زاغ و زغن ہزار کا گھر بولتے نہیں
خدا کا شکر ، عقائد ہیں اپنے حق اے شوقؔ
نہ نیچری ہیں ، نہ ہم قادیان والے ہیں
کر تجسس گوہر مقصود مل جائیں گے شوقؔ
دل کے ویرانے میں گنج معرفت پوشیدہ ہے

غزلیں

جبیں نازاں

J23, 2nd Floor, Near Abdullah Masjid, Gali No. 12,
Ramesh Park, Laxmi Nagar, New Delhi- 110029
(Mob. 9801315572)

اس درجہ سخت جان ہماری ہے زندگی
بانہوں میں موت کی بھی نہ ہاری ہے زندگی

دُکھ درد سے ، نہ رنج سے عاری ہے زندگی
آہ و بکا ہے ، گریہ و زاری ہے زندگی

کہتے ہو تم کہ ہم پہ تو بھاری ہے زندگی
شکوہ کئے بغیر گزاری ہے زندگی

مشکل کو میں نے ڈال کے الجھن میں رکھ دیا
رنج و الم سے جب بھی سنواری ہے زندگی

سمجھے نہ راز ہستی ، بتائے انہیں کوئی
پھولوں کی سیج ہے ، نہ بہاری ہے زندگی

مجبور ہو کے بیٹھے نہیں ہیں تری طرح
آغوشِ رنج و غم میں نکھاری ہے زندگی

ورنہ ، اڑا ہی دیتا ہوا میں وہ مشت خاک
رکھا ہے چاک پر تو سدھاری ہے زندگی

ہم نے قریب مرگ اجل سے کہا ، ٹھہر
تو جانتی نہیں ، بڑی پیاری ہے زندگی

❁❁❁

شاذیہ نیازی

Alam Nagar, Burnpur, Asansol - 713325
(Mob. 8250564231)

لشکر نہ تخت و تاج سے جیتی گئی ہے جنگ
امروز بس مزاج سے جیتی گئی ہے جنگ

دو چار دن کی بھوک کسی کام آ گئی
سڑتے ہوئے اناج سے جیتی گئی ہے جنگ

ماتھے پہ اس نے چوم کے شاداب کردیا
یعنی اسی علاج سے جیتی گئی ہے جنگ

ایسے نہیں یہ ہجر کی شب کٹ گئی جناب
دن بھر کے کام کاج سے جیتی گئی ہے جنگ

اس بار کوئی شور شرابہ نہیں ہوا
خاموش احتجاج سے جیتی گئی ہے جنگ

رانی لگا نے آئی تھی تلوار پر تلک
شاید اسی رواج سے جیتی گئی ہے جنگ

❁❁❁

غزلیں

مصلح الدین کاظمؔ

Rani Sakarpura, Dist. Khagaria - 851204
(Mob. 9304780668)

خاکساری چاہیے کردار سازی چاہیے
پارسائی کے لئے تو بے نیازی چاہیے
کاکل سرکش دبا کر کیا کریں اس دور میں
سرکشی میں اور زلفوں کی درازی چاہیے
عشق تو عشق حقیقی ہے خدا کے واسطے
پھر بھی جینے کے لئے عشق مجازی چاہیے
رہ گزارِ عشق میں کوئی رفاقت کے لئے
مال و زر کے ساتھ یارو دل نوازی چاہیے
ہر گھڑی دنیا کی لذت سے رہو تم بے نیاز
دین و دنیا میں تمہیں گر سرفرازی چاہیے
سن اے کاظمؔ ! دشمنوں پر غلبہ پانے کے لئے
جنگ کے میدان میں بھی جاں کی بازی چاہیے

حافظ تمنا پھلواروی

"Tamanna Lodge" Sangi Masjid, Phulwarisharif
Patna - 801505 (Mob. 9931606459)

وفا میں کیسا یہ جادو سا کر دیا تم نے
دلِ غریب کو وحشت سے بھر دیا تم نے
ہر اک نگاہ ترستی ہے روشنی کے لئے
ہمارے عہد کو بے نور کر دیا تم نے
رُخِ حیات پہ چھایا ہے خوف کا سایہ
دل و دماغ کو یہ کیسا ڈر دیا تم نے
کمند ڈال رہے ہیں وہ آسمانوں پر
زمین والوں کو ایسا ہنر دیا تم نے
نئے مزاج میں انسانیت کا نام نہیں
یہ کیسا زہر دماغوں میں بھر دیا تم نے
کسی کے دامن ہستی سے لے لیا ذرّہ
کسی کو تحفہ شمس و قمر دیا تم نے

ابیاتِ زیبا

برق و سیماب نے کہاں پایا — اس دلِ بے قرار کا عالم (مصحفیؔ)
کیا چیز بھلا قصر فریدوں مرے آگے — کانپے ہے بڑا گنبد گردوں مرے آگے (انشاؔ)
کوئی عشق میں مجھ سے افزوں نہ نکلا — کبھی سامنے ہو کے مجنوں نہ نکلا (آتشؔ)
تفسیر دو عالم ہے شکیلؔ اپنا تغزل — میدانِ غزل چھوڑ کے ہم جا نہیں سکتے (شکیلؔ)

نام کتاب	:	درد میں تیرتے پھول
مصنف	:	پرویزؔ مظفر
ناشر	:	مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۵ء صفحات : ۲۴۰
قیمت	:	۳۹۹ روپے
مبصر	:	ثنا اللہ ثناؔ دوگھروی

پرویزؔ مظفر اردو ادب کا جانا پہچانا نام ہے۔ موصوف اپنے عہد کے عظیم المرتبت، شاعر و ادیب اور باوقار تنقید نگار مظفر حنفی کے صاحبزادے ہیں اور عرصہ دراز سے اردو ادب کی خدمات میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔ پیش نظر شعری مجموعہ ''درد میں تیرتے پھول'' سے قبل بھی موصوف کی کئی کتابیں منظر عام پر آ کر ادبی حلقے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کتابوں میں ''پرچم گرد باد'' (ترتیب) ''تھوڑی روشنی'' (شاعری) ''اداس نظمیں'' (شاعری) کے نام خاص طور سے لئے جاتے ہیں، جن میں ان کے تجربات و مشاہدات اور افکار و نظریات کھل کر سامنے آئے ہیں۔

پرویزؔ مظفر کے زیر نظر مجموعہ ''درد میں تیرے پھول'' کی ابتدا ایک ''توشیحی'' نظم بنام پرویزؔ مظفر سے ہوتی ہے جسے ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ نے لکھا ہے۔ اس کے بعد چار مضامین شامل ہیں جن میں دو مضمون ''شعر، سماج اور سچائی: پرویزؔ مظفر کی شاعری کا آئینہ'' اور ''پرویزؔ مظفر کی نظم نگاری: عصری آگہی داخلی کشمکش اور سماجی احتجاج'' پروفیسر شیخ عقیل احمد کے قلم سے ہے اور ایک مضمون ''پرویزؔ مظفر'' کے عنوان سے ولی عالم شاہین کا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مضمون ''اداس نظمیں'' کے عنوان سے ہے ڈاکٹر ابراہیم افسر نے لکھا ہے۔ کتاب کے اخیر میں فراز عارف اور ڈاکٹر منصور خوشتر کے دو مضامین ہیں جو انگریزی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تمام کے تمام مضامین بڑے ہی پر مغز ہیں اور اس اعتبار سے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ پرویزؔ مظفر کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھنے میں بہت ہی مددگار ثابت ہوتے ہیں اور قارئین کو پرویزؔ مظفر کی نظموں اور غزلوں کی تفہیم سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ کتاب کے نام کے اعتبار سے سرورق بھی اپنے آپ میں کافی معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ انتساب بھی بہت جذباتی ہے جو ان کے بڑے بھائی فیروز مظفر کے نام ہے۔ اس انتساب کی عبارت دیکھئے:

''ہمارے پاپا سے جنون کی حد تک محبت اور عقیدت رکھنے والے بھائی جان فیروز مظفر کے نام۔''

اس کے بعد مظفر حنفی کا ایک قطعہ ہے۔ کتاب کی ابتدا نظموں سے ہوتی ہے، جس میں مختلف عنوانات کے تحت ایک سو پانچ نظمیں شامل کی گئی ہیں، ساری نظمیں آزاد ہیں۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں ۳۷ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ اسی طرح الگ سے باب قائم کر کے ۸۹ متفرق اشعار کی شمولیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے، جو زندگی کے مختلف مسائل اور موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔

پرویزؔ مظفر کی شاعری خواہ نظمیہ ہو یا غزلیہ دونوں جگہ ان کے یہاں عصری حسیت کی بازگشت نمایاں ہے۔ ہر فنکار کے یہاں خواہ وہ کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہے، اس کا عہد بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ پرویزؔ مظفر کے ساتھ بھی کچھ یہی بات ہے، ان کی شاعری میں ان کا عہد پوری شدت کے ساتھ قاری کو صدائیں دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی المناکیوں، ظلم و جبر اور اس ظلم و ستم پر خاموشی اختیار کرنے کے جرم وغیرہ کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک نظم بعنوان ''فلسطین'' (مشمولہ، ص ۱۴۱) ملاحظہ ہو:

خواب سے پرے
حقیقت سے ڈرے
کوئی قدم کدھر دھرے

معصوم جانیں
لوگ ڈرے ڈرے
آگ ٹوٹ کر برستی ہے
آنکھ بھی چھلکتی ہے
منظر دیکھ کر
دنیا کو سب معلوم ہے
آنسو کا حساب
ظلم کی کھلی کتاب
لہو سے لکھی جا رہی ہے داستاں
مگر لکھنے کو تیار نہیں
ظلم کا سچ
بس مصنوعی صورت بنائے
تماشہ دیکھ رہے ہیں سب

پرویز مظفر کی نظم نگاری ایک باوقار مقام پر فائز نظر آتی ہے۔ان کی نظموں میں الفاظ کی بازیگری دیکھنے کو نہیں ملتی، بلکہ ایک حقیقت پسندانہ رویہ جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے یہاں غم دوراں اپنے خاص رنگ میں نظر آتا ہے، جہاں سماجی ناانصافی، تہذیبی بحران، انسان سے دور ہوتی انسانیت وغیرہ عناصر کو نظمیہ شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔غزلوں کی طرح ان کی نظمیہ شاعری کا کینوس بھی بہت وسیع نظر آتا ہے جس پر انہوں نے اپنے افکار کے رنگوں سے آج کے عہد کی تصویر بنائی ہے۔

پرویز مظفر کی شاعری میں رنج وغم، رشتوں کا کرب، لوگوں کی بے راہ روی وغیرہ جیسے زندگی کے حقائق کو بھی خوبصورت انداز میں شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں قاری کو اپنی جانب کھینچے رکھنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے اور یہی کسی فنکار کی بڑی کامیابی کہی جاتی ہے۔

انہوں نے اپنی شاعری میں زندگی کے مختلف رنگ اور جہات کو انتہائی سادگی کے ساتھ سلیس الفاظ میں بیان کیا ہے۔زندگی کے حوالے سے قاری کو ان کے کلام میں بہت کچھ ملتا ہے۔ان کی شاعری میں جہاں رنج وغم کی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں، وہیں زندگی کے بہت سے مسائل کو بھی انہوں نے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ان کے کلام میں فلسفیانہ رنگ بھی نمایاں ہے اور سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی موجودگی بھی موثر انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

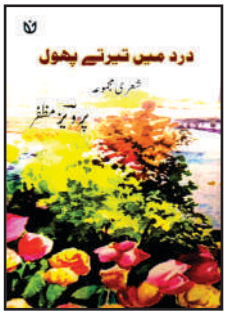

مزید برآں ان کے یہاں محبت، فراق، وصال، خوشی اور غم جیسے عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے جو ان کے کلام کو زندگی کی دھڑکنوں سے نزدیک کر دیتی ہے۔

پرویز مظفر کے کلام میں فکر کی گہرائی نمایاں طور سے دیکھنے کو ملتی ہے۔نظمیں ہوں یا غزلیں ہر جگہ معنویت کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔مطالعے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں تہہ در تہہ معنی ومفاہیم پوشیدہ ہیں جو یکے بعد دیگرے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی باتیں کہنے میں کسی تصنع سے کام نہیں لیتے بلکہ سیدھے سادے انداز میں اس سلیقے سے بیان کر جاتے ہیں کہ اشعار قاری کو اپنی جانب متوجہ کئے بغیر نہیں رہتے۔

پرویز مظفر کے کلام میں معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔ان کی غزلوں میں جہاں عصری آگہی کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں ماضی کے دریچے بھی وا نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں ان دونوں کو بہت ہی حسین انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ نمایاں حد تک کامیاب ہیں۔ان کی شاعری میں جہاں زندگی کے نشیب وفراز ہیں، وہیں جمالیاتی عناصر کی کارفرمائی بھی ہے۔انہوں نے نہ صرف اپنی نظموں میں بلکہ اپنی غزلوں میں بھی زندگی کے مختلف رنگوں اور مسائل کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی ہے۔نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ جانے کیوں میاں پرویز ہیں افسردہ افسردہ
گلے ہنس کر ملے، لیکن ہنسے افسردہ افسردہ

گھر پڑوسی کا جلا کر تم کہاں محفوظ ہو
میرا کیا ہے جانب صحرا نکل جاؤں گا میں

اکثر ملول ہوتے رہے ہیں خوشی میں بھی
جو دکھ اُٹھا چکے ہیں انہیں یاد کر کے ہم

بھائی بھائی میں انسیت نہ رہی
پھانس جیسا کھٹک رہا ہے لہو

ہاتھ میں امن کا پرچم تو اُٹھائے ہوئے ہیں
کس لئے خون میں سب لوگ نہائے ہوئے ہیں

ہرایک چہرے پر ہیں مکھوٹے کئی
یہی آج کل کا ہنر ہے میاں

بڑے شہروں کے یہ بہروپئے لوگ
بڑا گھر دل ہے چھوٹا دیکھ لینا

گفتگو کرتا تھا کل تک شہد میں ڈوبی ہوئی
اک ترقی کیا ملی لہجہ نوابی ہو گیا

بچاؤ اپنی شہنائی سنبھل کر
فضا مغموم ہوتی جا رہی ہے

اس نے دیکھا رقیب کو ہنس کر
اس طرف ہم نے دل کو تھام لیا

ہوک سی اُٹھ رہی ہے سینے میں
تونے پرویزؔ کس کا نام لیا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں پرویزؔ مظفر کی شاعری میں ان کے تجربات و مشاہدات، افکار ونظریات، انسانی جذبات واحساسات، زندگی کا کرب، معاشرتی ناہمواری، غربت وغیرہ کو بہتر تشبیہات واستعارات کے ساتھ حسین پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ہی انداز بیان میں ندرت کا پہلو بھی روشن ہے۔ اس طرح یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی کہ پرویزؔ مظفر کی اس کوشش کی ادبی حلقے میں پذیرائی ہوگی اور ان کا یہ شعری مجموعہ ''درد میں تیرتے پھول'' ادبی دنیا سے اپنا حصہ خود ہی وصول کرلے گا۔

نام کتاب	:	آبلے پھوٹ پڑے
مصنف	:	سرورؔ نگینوی
مرتب وناشر	:	خورشید احمد انصاری
اشاعت	:	۲۰۲۵ء صفحات : ۱۴۰
قیمت	:	۳۰۰ روپے
مبصرہ	:	صبیحہ اطہر

اردو شعروادب کی دنیا میں سرورؔ نگینوی کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو پیدا ہونے والے اور ۶/مارچ ۲۰۲۵ء کو اس دار فانی کو الوداع کہنے والے ریاست اتر پردیش کے نگینہ قصبہ کے اس نگینہ کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آئے جن کی اردو شعروادب کی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ان مجموعوں میں ''بکھرا بکھرا لہجہ''، ''سہرے کا پھول''، ''کلیات فروغ نگینوی'' کا ذکر خاص طور سے کیا جا سکتا ہے۔ شعری وادبی خدمات پر انہیں عبدالرزاق انصاری ایوارڈ برائے شاعری سال ۲۰۱۷ء راجی جھارکھنڈ اور علامہ اقبالؔ ایوارڈ برائے شاعری اتر پردیش سال ۲۰۱۴ء سے نوازا گیا تھا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں سرورؔ نگینوی اپنی نئی تصنیف جو زندگی کی آخری تصنیف ثابت ہوئی ''آبلے پھوٹ پڑے'' کی طباعت کے تعلق سے سرگرم تھے، لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ان کی حیات میں نہ ہوسکا۔ اب سرورؔ نگینوی کے ناگہانی انتقال کے بعد خورشید احمد انصاری نے بہ طور مرتب ''آبلے پھوٹ پڑے'' کو منظر عام پر لایا ہے اور سرورؔ نگینوی کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب سرورؔ صاحب کی شاعری کی افہام وتفہیم کے نئے باب وا کرے گی۔

زیر نظر کتاب میں اس کے مرتب خورشید احمد انصاری نے ''عرض مرتب و ناشر'' کے عنوان سے سرور نگینوی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''پرتجسس ذہن، اظہار پر قدرت، دنیا کو دنیا کے طریقے سے جینے والے، سرورؔ نگینوی ہمہ وقت سوچتی آنکھوں سے دنیا گزار کر چلے گئے، ان کے بہت سے اوصاف کی معترف

دنیا آج بھی ہے۔ وہ اثبات نفی کے دائروں کی پرواہ کیے بغیر حق کی راہ پر چلتے ہوئے دین ودنیا کی سرخروئی کے ساتھ اپنا مقدر بنانے میں کامیاب رہے۔''

مرتب کی رائے کے بعد ''سرور نگینوی میرے قدیم دوست'' کے عنوان سے ڈاکٹر خالد علوی کا مضمون ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''سرور نگینوی میرے اتنے قدیم دوست ہیں کہ اگر غالبؔ کے لفظوں میں کہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اتنا پرانا دشمن بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اپنی زندگی انہوں نے اس طرح گزاری ہے کہ کچھ دن بڑے طمطراق سے کسی کام میں مصروف ہیں پھر اس منافع بخش کام کو تیاگ کر قلندری پر نکل پڑے۔ وطن سے ہجرت کی تو کوئلے کی کانوں کے دیس جھریا پہنچ گئے۔ ایک طویل عرصہ کوئلے کی نگری میں خاک چھانی۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ہاتھ کالے نہیں ہونے دیئے بلکہ وہاں کی ادبی محفلوں میں بہ آواز بلند شرکت کی۔ وہاں ان کی رفاقت آمر سے ہوئی (جسے مرحوم لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے) وہ آمر کی ذہانت اور صلاحیتوں کے بہت قابل تھے۔ اس زمانے میں جھریا اور آس پاس کے علاقوں میں شعروسخن کا ماحول بہت گرم تھا۔ سرورؔ نے بھی حسب توفیق اپنے حصے کی آگ روشن رکھی۔ اس مجموعے کے نام 'آبلے پھوٹ پڑے' سے ہی ظاہر ہے کہ وہ اب غم جاناں سے زیادہ غم دوراں محسوس کرتے ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جو سرورؔ کی دروں بینی اور نیک نفسی کا پتہ دیتے ہیں ؎

مجھے آسودگان منزلِ ہستی سے کیا نسبت
مگر سرورؔ سکون بیکراں کو میں سمجھتا ہوں

کچھ اشعار بالکل نئی حسیت لئے ہوئے ہیں ؎

اب سڑک بھی گہرے سناٹے کی زد میں آ گئی
اب ہمیں بھی گھر میں چل کے اپنے سونا چاہیئے

''نگینے کا نگینہ: سرور نگینوی'' کا عنوان دے کر فاروق ارگلی نے لکھا ہے کہ:

''راقم الحروف گزشتہ چالیس برسوں سے سرور صاحب کی شاعری اور اردو ادب وتہذیب سے ان کی والہانہ محبت سے واقف اور ان کی شخصیت کے خوبصورت پہلو کا مداح ہے۔ سرورؔ نگینوی نے جس ذہانت، تخلیقی صلاحیت اور محنت وریاضت کے ساتھ اپنے ہم عصر شعرا میں اپنی خاص پہچان بنائی، اس سے وہ سچ مچ کے نگینوی یعنی اپنے مردم خیز قصبہ نگینہ کے نگینہ ثابت ہوئے۔ سرورؔ کا کلام مشاعروں سے زیادہ رسائل وجرائد، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ اردو دنیا میں دور تک پہنچا ہے۔ سرورؔ کا پہلا شعری مجموعہ 'بکھرا بکھرا لہجہ' نو کلاسیکی غزل میں قابل قدر اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔''

بہ عنوان ''سرورؔ نگینوی ایک باکمال شاعر'' ڈاکٹر رونقؔ شہری رقمطراز ہیں کہ:

''سرورؔ نگینوی کی جدوجہد بھری زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ لیلائے زندگی کی قربت حاصل کرنے کے لئے شیشہ ادراک سے کوہ کنی کی ہے۔ سرورؔ نگینوی نے اپنی طویل شاعرانہ ریاضت میں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ زندگی جس شکل میں فراہم ہے اسے حاصل کیا جائے۔ ان کی اسی خلوص نیتی نے ایک مخصوص والہانہ پن کے ساتھ شعری اظہار کو معتبر بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں تصنع نام کی چیز کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ شاعری میں یہ روایت کے حسن کے پرستار ہیں تو دوسری طرف عملاً ترقی پسندی کے راست اظہار اپناتے وقت کوئی قباحت نہیں محسوس کی ہے وہیں جدت اور جدیدیت کا بھی انھیں عرفان ہے، اس لئے انہیں گمراہ کن رویے سے سابقہ نہیں پڑتا ہے۔ سرورؔ نگینوی نے متعدد مقامات پر قارئین غزل کو ششدر کرنے کا لفظیاتی حربہ استعمال نہیں کیا ہے اس کی وجہ ہے کہ یہ معنی کی تہہ داری پیدا کرنے کے لئے مروجہ الفاظ کے کبھی محتاج نہیں رہے۔ میرے اس دعوے کے بین ثبوت کے لئے یہ اشعار پیش ہیں ؎

شاعرو! تم نے کیا ہے غور اس پر بھی کبھی
یہ مذاق شعر اور دانشوری دیتا ہے کون

چشم رحمت سے ہم عاصیوں کو
خاتم المرسلین دیکھتے ہیں''

کتاب میں موجود ان افراد کے خیالات سے سرورؔ نگینوی کی شعری شخصیت کا بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

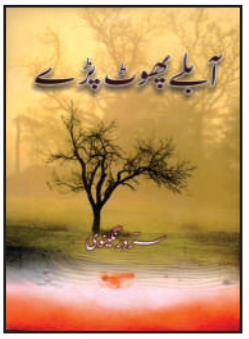

سرورؔ نگینوی کی شاعری میں سب سے اہم بات جو نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری میں ان کی خود کی موجودگی کا احساس مضمر ہے اور ''آبلے پھوٹ پڑے'' میں غزلیں اس احساس کا نمایاں ثبوت ہیں۔ ''آبلے پھوٹ پڑے'' میں سرورؔ نگینوی کی شاعری کا آغاز حمد سے ہوا ہے ؎

ناز کی پتوں کو گل کو تازگی دیتا ہے کون
ہوتپش جب دھوپ کی چھاؤں گھنی دیتا ہے کون
عالم امکاں ہے کس کے دسترس میں جان لو
رنج وغم یہ کون دیتا ہے خوشی دیتا ہے کون
حمد کہنے کی سعادت کون کرتا ہے عطا
حمد کہنے کے لئے الفاظ بھی دیتا ہے کون

حمد کے بعد کتاب میں نعت کو رکھا گیا ہے جس میں پیغمبر آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت کا اظہار ملتا ہے ؎

مصطفےٰ کی زمیں دیکھتے ہیں
یعنی خلد بریں دیکھتے ہیں
سبز گنبد کے جلوؤں کا منظر
کس قدر دلنشیں دیکھتے ہیں

حمد اور نعت کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، پھر مظفرنگر کے فساد کے تعلق سے طویل نظم ''مظفرنگر کے فساد سے متاثر ہوکر'' ہے جس میں فساد کا ہولناک منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کے بعد ''ایک نوجوان سے شادی کے دو ماہ بعد طلاق لینے پر'' کے عنوان سے ایک اور نظم ہے جب کہ قطعات پر کتاب کا اختتام ہوا ہے۔

یہاں اشعار میں تجربے اور مشاہدے کی ملاوٹ کا برملا اظہار اس لئے بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ شعر کہتے وقت ان کا ذہن ماحول کے انسلاکات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ''آبلے پھوٹ پڑے'' کو ایک معتبر کتاب قرار دینے کے ساتھ ساتھ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ مرتب کی کوشش ضرور کامیاب ہوگی۔

نام کتاب	:	شعلہ گل
مصنف	:	ہندیؔ گورکھپوری
مرتبہ وناشرہ	:	ثمینہ ادیب ضیاؔ
اشاعت (دوم):	۲۰۲۵ء	صفحات : ۳۴۸
قیمت	:	۳۰۰ روپے
مبصرہ	:	نباہت ملک

اس سے پہلے کہ میں زیر نظر کتاب ''شعلہ گل'' پر کوئی رائے ظاہر کروں، میں کتاب کی مرتبہ ثمینہ ادیب ضیاؔ کو مبارکباد پیش کرنا چاہوں گی جن کی کوششوں سے ۴۱ برس کے طویل عرصے کے بعد مذکورہ کتاب کی دوبارہ اشاعت ممکن ہوسکی۔ سچ کہیں تو ''شعلہ گل'' کی دوبارہ اشاعت نہ صرف ثمینہ صاحبہ کی اپنے والد وحیداللہ انصاری (ہندیؔ گورکھپوری) سے جو کتاب کے مصنف ہیں، بے پناہ محبت کا ثبوت پیش کرتی ہے بلکہ اس سے اردو شعروادب سے خود ان کی ذاتی اور گہری وابستگی بھی ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساحرؔ داؤدنگری (انصاری اطہر حسین) نے کتاب میں شامل اپنے مضمون ''ثمینہ ادیب ضیاؔ کی ادبی ضیاء'' میں ان کا مختصر مگر مدلل تعارف کرایا ہے۔

مذکورہ کتاب کی بات کی جائے تو اس کا آغاز ثمینہ ادیب کی ''عرض داشت'' سے ہوا ہے جس میں مرتبہ نے مصنف کے تعلق سے اہم معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ شعروادب کے ذریعے فروغ اردو کے عملی اقدامات کے سوا میرے والد

مرحوم کا کوئی دوسرا نظریہ نہیں تھا۔ اہل اردو کے درمیان رہ کر خود کو مقبول کرانا بھی ان کا مقصد نہیں تھا، نہیں تو وہ اپنے دَور کے نام چیں ادیبوں کی معرفت کا سہارا لے کر بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے، لیکن باضمیر اخلاق مند افراد کبھی اپنی انا کا سودا نہیں کرتے اور ایسا ہی میرے والد نے بھی کیا ۔ ہندوستان کی متحدہ قوم کے جس نظریے کی وکالت فراقؔ گورکھپوری نے کی، میرے والد مرحوم بھی اس کے حامی رہے۔''

وہ اپنی بات اپنے والد کے اس شعر کے ساتھ مکمل کرتی ہیں ؎

ظلمتوں کو سیاہ بختی کی
روشنی میں سمو رہے ہیں ہم

بہ عنوان ''تعارف'' اپنے مضمون میں محمود الٰہی لکھتے ہیں کہ:

''اردو شاعروں میں وہی زیادہ کامیاب ہوئے جنھوں نے مزاج کی تبدیلی کے عمل میں اس کے فطری آداب کو ملحوظ رکھا۔ ہندیؔ صاحب کا شمار بھی شاعروں کی اسی صف میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تحریک آزادی کے زیر اثر سیاسی اشعار کہے، لیکن اردو کے خمیر سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی۔ ہندیؔ صاحب نے گزشتہ چالیس سے پینتالیس سال میں بہت کچھ کہا، ان کا 'شعلہ گل' ان کے کلیات شعر کا نمائندہ انتخاب ہے، جس کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اردو شاعری کی رفتار ترقی کو تیز کرنے میں ہندیؔ صاحب کی خدمات کم نہیں ہیں۔ وہ اپنے ممتاز معاصرین کے ہم عنان و ہم رکاب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی خاموش فطرت اور شرافت شعر کی وجہ سے شہرت کی دریوزہ گری نہیں کی۔''

''تعارف'' کے بعد ۱۹؍جون ۱۹۸۴ء کو لکھی گئی ہندیؔ گورکھپوری کی تحریر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''شاعری مجھے ورثہ میں ملی، گھر میں اردو کی تعلیم کے علاوہ 'گلستاں بوستاں' کا مطالعہ عام تھا، ایسے ماحول میں بچپن ہی سے مجھ میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد سینٹ اینڈریوز کالج میں انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں کلکتہ میں علامہ عبدالجبار وحیدی کے روزنامہ اخبار 'زمانہ' کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوا۔ پیری ڈیہہ ٹرین ڈکیتی کیس میں 'پیاینئر' کا نامہ نگار خصوصی تھا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۴ء میں فیض آباد ملٹری ایریا میں آرمی لنگویج ٹیچر مقرر ہوا۔ انقلابی اور باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ملٹری ایریا سے فرار ہونا پڑا۔ ۴۵-۱۹۴۴ء میں باغیانہ نظموں کی وجہ سے ٹانڈہ فیض آباد میں وارنٹ گرفتاری جاری ہوا اور کئی ماہ تک روپوش رہا۔ میری ایک مشہور نظم 'جوانوں سے خطاب' ۱۹۳۸ء میں 'ہندوستان' میں شائع ہوئی تھی جو 'آزادی کی نظمیں' ضبط شدہ کتاب میں شامل ہے، مگر مرتب نے کسی ناواقفیت کی وجہ سے میرے نام کی جگہ 'نامعلوم' لکھ دیا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں اجودھیا کے کانگریس اجلاس کے مشاعرے میں جس کی صدارت جواہر لعل جی نے کی تھی، میں نے یہی نظمیں پڑھی تھیں، جس کی انھوں نے بہت تعریف کی تھی۔ مجھے دو ایوارڈ مل چکے ہیں 'قومی شاعری ایوارڈ' اور 'میرا کادمی ایوارڈ''

ہندیؔ گورکھپوری مزید لکھتے ہیں کہ:

''میری زندگی کا مسلک 'انتہائی' رجائی اور شاعری میں میرا مسلک 'آداب برائے زندگی' ہے۔ میری شاعری ہمیشہ مقصدی اور تعمیری رہی۔ اپنی شاعری سے میں جنگ آزادی میں برابر حصہ لیتا رہا اور غلام ذہنوں کو جھنجھوڑتا رہا۔ میں نے انقلابی اور باغیانہ رجحانات کو غزلوں میں سمویا۔ حب الوطنی میرے خمیر میں ہے، اس لئے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جذبات کو بھی ابھارتا رہا۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہندیؔ گورکھپوری اُس دور کے لوگوں میں تھے جو خودستائی اور شہرت سے دور بھاگتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ابھی پیش کئے گئے

اقتباس میں ہندی گورکھپوری نے اپنا بہت ہی مختصر تعارف دیا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ ان کی شخصیت اس تعارف سے بہت اوپر ہے اور کسی کو یہ بھی کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے کہ ہندی گورکھپوری قلم کے ہی نہیں ملک کی بھی عظیم سپاہی تھے۔ زیرنظر کتاب کا باضابطہ آغاز حمد الٰہی کے ساتھ ہوا ہے جس کے کچھ اشعار اس طرح ہیں ؎

وہ کافر ہے یقیں جس کو نہ ہو اُس ذات باری کا
یہ عالم ہے کرشمہ گاہ اس کی کردگاری کا
جو وہ چاہے تو دریوزہ گری میں کج کلا ہی ہو
جو وہ چاہے تو سر پر فقر کے بھی تاجِ شاہی ہو
جو وہ چاہے تو ہر ادنیٰ کو اعلیٰ مرتبہ بخشے
جو وہ چاہے تو گمراہوں کو ظلمت میں ضیا بخشے
وہ چاہے خاک کے ذرّوں کو دُرِّ بے بہا کردے
ہر اک موجِ بلا کو موجِ ساحل آشنا کردے
جو وہ چاہے تو ہر آتش کدہ گلزار ہو جائے
جو وہ چاہے تو کشتی ڈوب کر بھی پار ہو جائے

حمد کے بعد نعتیہ کلام ہے جس کے اشعار دلوں کو باغ باغ کردیتے ہیں ؎

مرے دل میں حب رسول ہے مری جاں فدائے رسول ہے
اُسے فکر روزِ جزا ہو کیا وہ جو آشنائے رسول ہے
ہے اُنھیں کے دم سے یہ رنگ و بو، ہے انھیں کے دم سے یہ کاخ و کو
یہ جہاں برائے رسول ہے وہ جہاں برائے رسول ہے
یہ عروج ایسا عروج ہے کبھی عقل میں نہ سما سکے
جہاں قدسیاں بھی نہ جا سکے وہاں نقش پائے رسول ہے
دل و جان ایسے جمال پر ہیں نثار ہندی خستہ جاں
نہ ملک میں ہے نہ بشر میں ہے کہ عجب لقائے رسول ہے

حمد و نعت کے بعد ایک اور نظم ''خودی کا واسطہ تجھ کو، نہ کھا فریب نہ کھا'' کے عنوان سے ہے جو قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے ؎

بتانِ دہر کے آگے تو اپنا سر نہ جھکا
خیالِ وہم و تقدس میں زندگی نہ مٹا
خودی کا واسطہ تجھ کو نہ کھا فریب نہ کھا
ہر ایک شاخ شجریاں کی صرفِ طوفاں ہے
اے مرغِ صدرہ نشیں اس پہ آشیاں نہ بنا
خودی کا واسطہ تجھ کو نہ کھا فریب نہ کھا

ایک نظم ''صبح بنارس'' کے عنوان سے ہے جس میں انتہائی خوبصورت انداز میں گنگا کے ساحل پر موجود بنارس شہر کی منظر کشی کی گئی ہے ؎

یہ معصوم جلوے حسیں پیارے پیارے
زمیں پہ یہ اترے ہوئے چاند تارے
یہ شبنم، یہ شعلے، یہ گل، یہ شرارے
یہ کون آ رہا ہے کنارے کنارے
یہ گنگا کا ساحل یہ دلکش نظارے
یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے
خراماں خراماں حسینوں کا جھرمٹ
شباب آفریں نازنینوں کا جھرمٹ
تہہ آب بھی مہ جبینوں کا جھرمٹ
یہ روپ اور رنگت خدا کے سنوارے
یہ گنگا کا ساحل یہ دلکش نظارے
یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

زیرنظر کتاب سے ''رباعیات اردو'' کے دو نمونے بھی دیکھئے ؎

ہر رنگ کے پھولوں کا چمن ہے اُردو
ہر قسم کے مشکوں کا ختن ہے اُردو
صدحیف سمجھتے نہیں دشمن اس کے
ہے جسم وطن جانِ وطن ہے اُردو

معمور تجلی ہے دماغ اردو
رشک ارم و خلد ہے باغ اردو
عالم میں چلے لاکھ مخالف کی ہوا
گل کر نہیں سکتی ہے چراغ اردو

''اے شہیدان وطن تم کو سلام'' کے عنوان سے نظم میں ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے جس کے چند شعار حاضر ہیں ؎

اے بہادر شاہ اے عالی مقام
۵۷ کے شہیدوں کے امام
عزم مستحکم ترا حسن دوام
تا ابد روشن رہے گا تیر انام

ہند کی عظمت ہے تجھ سے لا کلام
۵۷ کے شہیدوں کو سلام

یادگار عظمت قوم وطن
جرات و ہمت میں ارجن کا چلن
ہر ادا ٹیپو کا یکسر بانکپن
ہر نظر ہمت وہ دار و رسن

سر سے پا تک سر فروشانہ پیام
۵۷ کے شہیدوں کو سلام

زیر نظر کتاب کا اختتام قطعات پر ہوا ہے، کل تیس قطعات شامل کتاب ہیں اور ہر قطعہ کسی نہ کسی پیغام کا ضامن ہے، مثلاً ؎

عدل نے تخریب کے ہاتھوں سے پھر
اس نظامِ کہنہ کی تجدید کی
تیرہ گاہوں میں سویرا ہو چلا
دیکھو وہ پھوٹی کرن اُمید کی

نہ تعلیم عزت نہ دولت نہ زر ہے
نہ دنیا میں راحت نہ دیں کی خبر ہے
ڈراتا ہے کیا ہم کو دوزخ سے واعظ
غلامی ہی دنیا میں نار سقر ہے

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب میں اس کے بالغ نظر مصنف نے دین اور دنیا دونوں کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے جب کہ محترمہ ثمینہ ادیب ضیاؔ کی ترتیب نے بھی اس کا حسن بڑھانے میں کوئی کمی نہیں آنے دی ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ اس بات کا یقین ہے کہ یہ کتاب سب کو پسند آئے گی۔ ❁❁

تنقید، مقدمہ نگاری اور تبصرہ نگاری

کسی فنکار کے پختہ تنقیدی شعور کے بغیر اس کا تخلیقی ادب درجہ اعتبار کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایک نقاد تخلیق کار کی محض تعریف یا اس کی نکتہ چینی نہیں کرتا بلکہ اس کے انداز فکر و نظر کو نئی سمت و رفتار کی جانب موڑ دیتا ہے۔ لفظ ''تنقید'' اپنے دامن میں وسیع معنی رکھتا ہے..... کسی کتاب کے مقدمے کی حیثیت ایک بلند دروازے کی سی ہوتی ہے جس میں سے ہو کر قاری گزرتا ہے تو قلعہ فکر و فن کے کئی دیوان عام اور دیوان خاص اپنے نقش و نگار کی جانب اسے دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ اس لئے ایک مقدمہ نگار کا منصب قاری کے ذہن میں کتاب سے متعلق ایک دلچسپی، ایک تجسس پیدا کر دینا ہے۔ ایک مقدمہ نگار کے پیش نظر حال کا قاری بھی ہوتا ہے اور مستقبل کا قاری بھی، لیکن ایک تبصرہ نگار کے پیش نظر صرف سامنے کا قاری ہوتا ہے اور وہ تبصرے میں اپنے فوری ردعمل کا اظہار کرتا ہے، اس کا مخاطب زمانی اعتبار سے دور کا قاری نہیں ہوتا۔ چاہے مقدمہ نگار ہو یا تبصرہ نگار وہ فن تنقید کے مختلف طریقہ ہائے کار میں سے کسی کو بھی اپنا سکتا ہے۔ ایک مقدمہ نگار کا مقدمہ نہ تنقید کی طرح تفصیل و جزئیات کو جاتا ہے نہ تبصرے کی طرح فوری ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد تو صرف تصنیف کی چند ایسی خصوصیات کی طرف ہلکے سے اشارہ کرنا ہے جن کی آگہی سے قاری کے اندر کتاب پڑھنے کی اکساہٹ پیدا ہو..... تنقید یا تبصرے کے میدان میں نقاد یا مبصر کو لکھنے کی جتنی آزادی ملتی ہے۔ مقدمہ نگار کو اتنی آزادی نہیں ملتی اس کا سبب یہ ہے کہ تبصرہ ہو یا تنقید اسے ''لکھا'' جاتا ہے جب کہ مقدمہ یا پیش لفظ ''لکھوایا'' جاتا ہے۔

(پروفیسر کرامت علی کرامتؔ، اخذ و تلخیص: فروغ ادب، بھوپنیشور، ج ۲۵، ش ۲، ۲۰۱۹ء، ص ۳)

وفیات

پروفیسر شمیم صادقہ چل بسیں

پٹنہ: گزشتہ دنوں معروف ومنفرد افسانہ نگار پروفیسر شمیم صادقہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں انا للہ الخ۔ وہ کافی دنوں سے علیل تھیں، سنیچر ۳۰ اگست ۲۰۲۵ء کو انہوں نے، پٹنہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر آخری سانس لی اور یکم ستمبر ۲۰۲۵ء کو اُن کی تدفین عمل میں آئی۔ ڈاکٹر شمیم صادقہ کی تاریخ ولادت ۳؍جولائی ۱۹۴۸ء اور جائے ولادت پٹنہ ہے۔ ان کے والد محمد ایوب صدیقی، فارسی کے ایک باذوق اسکالر تھے جو شعبہ تعلیم، پٹنہ میں ملازمت رکھتے تھے۔ دورانِ ملازمت ہی انہوں نے آخرت کی راہ لی، جیسا کہ خود شمیم صادقہ نے لکھا ہے، وہ نہ صرف ''فارسی کے بڑے اسکالر جیسے تھے'' بلکہ ''ان کی الماری میں فارسی کا نایاب کلیکشن بھی تھا، اُنہیں کی زندگی کی ڈسپلن نے مجھے چٹان صفت بنایا۔''

شمیم صادقہ کی والدہ کا نام سعیدہ خاتون تھا انہیں دعائے مغفرت سے یاد کرتے ہوئے شمیم صادقہ نے اپنے چوتھے اور آخری افسانوی مجموعہ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ''میری زندگی کے ورق میری کہانیوں میں موجود ہیں۔'' وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''یہ میری ماں مرحومہ کا کمال ہے کہ وہ مذہب، کلام پاک اور احادیث کی تفہیم قطرہ قطرہ میرے اندر ڈالتی رہیں، آج میرے جو تجربے ہیں، وہ انہیں کی دَین ہیں۔ وہ خود بھی قرآن وحدیث پڑھتی رہتی تھیں۔''

ان سطروں سے یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ گویا شمیم صادقہ کو خوش قسمتی سے مذہبی اور علمی مزاج وماحول رکھنے والے والدین کی سرپرستی وتربیت ملی تھی اور پھر انہیں کے لفظوں میں ''استادوں کا ہاتھ تو ہر طالب علم پر ہوتا ہی ہے۔'' شمیم صادقہ ۱۹۶۷ء میں ایم اے کی سند لی۔ وہ اردو اور فارسی میں ماسٹر ڈگری رکھتی تھیں اور اُن کے پاس ڈاکٹریٹ کی سند بھی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ گورنمنٹ ویمنس کالج، پٹنہ کے شعبہ اردو میں آئیں اور تدریسی خدمات انجام دیتی رہیں۔ انہیں اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی سے بھی بڑی واقفیت تھی۔

پروفیسر شمیم صادقہ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۹ء کے آس پاس سے ہوا اور جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے ان کا پہلا افسانہ ''شاعر'' بمبئی میں چھپا تھا۔ اُن کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ ''کرچیاں'' ۱۹۷۹ء میں چھپا تھا جس کی بقول شمیم صادقہ، قرۃ العین حیدر نے بہت تعریف کی تھی، پھر ''ادھورے چہرے'' کے نام سے اُن کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ۱۹۸۰ء میں چھپا جو مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام یافتہ ہے۔ شمیم صادقہ کے تیسرے افسانوی مجموعہ کا نام ''طرح دیگر'' ہے جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' میں اشاعت یافتہ کہانی ''یہ اور وہ'' اور ''نارسائی'' بھی شامل ہے۔ یہ زمانہ اگرچہ فنی لحاظ سے اُن کی افسانہ نگاری کے عروج کا زمانہ تھا، مگر اس کے معاً بعد انہوں نے افسانہ نگاری کی دنیا سے طویل کنارہ کشی اختیار کرلی، یہاں تک کہ اُن کا چوتھا مجموعہ ''صحرے کی پیاس'' ۴۰ سال بعد ۲۰۲۳ء میں شائع ہوا۔ جس پر ''کتابوں کی دنیا'' کے تحت ''زبان و ادب'' نومبر ۲۰۲۴ء میں تبصرہ بھی چھپا تھا۔ ''صحرے کی پیاس'' کے منظر عام پر آنے سے تین سال پہلے کی بات ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، پٹنہ کے زیر اہتمام ''اکابرین ادب بہار'' کی اشاعت ڈاکٹر اسلم جاوداں کی ادارت میں ہوئی تھی جس میں صفحہ ۲۶۵ سے صفحہ ۲۷۶ تک پروفیسر شمیم صادقہ کا تذکرہ شامل ہے۔ یہ گویا ایک خاموش تحریک تھی، جس کے زیر اثر اور پھر امریکہ میں مقیم اپنے صاحب زادے تاجدار کی مسلسل یاددہانی سے انہوں نے افسانے کی دنیا میں اپنی واپسی قبول کرلی، مگر کون جانتا تھا کہ موت اس واپسی کو اتنی مختصر میعاد بنادے گی۔ اللہ بس باقی ہوس!

آہ! قاسم خورشید

پٹنہ:۔ گزشتہ دنوں، منگل ۳۰ ستمبر ۲۰۲۵ءکو ڈاکٹر قاسم خورشید اپنے چاہنے والوں سے اچانک ہی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے، انہوں نے اپنی رہائش گاہ واقع نوگھر واسلطان گنج، پٹنہ میں آخری سانس لی، بدھ یکم اکتوبر ۲۰۲۵ءکو مقامی شاہ گنج قبرستان میں اُن کا جسد خاکی آسودۂ لحد ہوا۔

ڈاکٹر قاسم خورشید اردو اور ہندی کے معروف و معتبر اور عالمی سطح پر اپنی شناخت اور مقبولیت رکھنے والے قلم کار تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲/جولائی ۱۹۵۷ء اور جائے پیدائش کاکو جہاں آباد ہے۔ ان کا گھریلو نام جعفر تھا اور ان کے والد سید غلام ربانی کی عرفیت خورشید سبحانی تھی۔ ان کے دادا سید غلام محمد عمر، اگر چہ وقت کے ذی ثروت لوگوں میں تھے، لیکن وقت نے یوں کروٹ بدلا کہ قاسم خورشید سے اپنا مولد، عہد طفلی میں ہی چھوٹ گیا اور اُن کا آب ودانہ انہیں پٹنہ لے آیا۔ ۱۹۷۵ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد، نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے تعلیم جاری رکھی اور اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی سے انٹر کرنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند اور وہیں سے ''گوپی چند نارنگ اور اس کی سوانح'' کی نسبت سے ''گوئدان تنقید'' پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لی۔ ۱۹۸۸ء کے آس پاس وہ عملی زندگی میں آئے اور SCERT (بہار، پٹنہ) میں اہم عہدے پر فائز رہے

قاسم خورشید کے پہلے افسانہ کا نام ''روک دو'' ہے جو بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے مجلّہ ''زبان وادب'' میں چھپا تھا۔ قاسم خورشید بہت ہی باغ و بہار، شخصیت کے مالک اور علمی اور ادبی کاموں میں ہمہ تن فعال و سرگرم رہنے والے آدمی تھے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''پوسٹر''، ''کینوس پر چہرے'' اور ''ریت پر ٹھہری ہوئی شام'' اشاعت یافتہ ہیں۔ ان میں پہلے مجموعہ کی ٹائٹل کہانی ''پوسٹر'' خاص طور سے مشہور ہے۔

قاسم خورشد کی دیگر تصانیف میں اردو اسٹیج ڈرامے کا مجموعہ ''تماشا'' (۲۰۱۹ء) اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''متن اور مکالمہ'' (۲۰۱۶ء) شامل ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں، جو نو ڈراموں پر مشتمل ہے، قاسم خورشید نے ''اپنی بات'' کو ''آغا حشر کاشمیری: ایسا کہاں سے لائیں'' کا ذیلی عنوان دیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ بجائے خود آغا حشر کے فن پر یہ ایک مبسوط، اعلیٰ قدر تجزیاتی تحریر ہے۔ ''متن اور مکالمہ'' اصلاً قاسم خورشید کی ''تخلیقی تنقید'' کا مجموعہ ہے، جس میں اپنا ''موقف''، انہوں نے ''تفہیم ورق در ورق'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کے بعد ''باز دید''، ''مصافحہ''، ''ہم نوا''، ''آئینہ گر''، ''تحریر نو'' اور ''خوشبو'' کے ذیلی عناوین قائم کر کے کتاب کو اختتام تک پہنچایا گیا ہے۔ پہلا ذیلی عنوان بارہ تحریروں پر، دوسرا، تیسرا اور چوتھا عنوان تین تین تحریروں پر محتوی ہے جب کہ پانچویں عنوان کے تحت چار اور چھٹے عنوان کے تحت تین تحریریں ہیں۔

مذکورہ تصانیف پر مستزاد قاسم خورشید کے شعری مجموعہ ''دل کی کتاب'' اور بچوں کے متعلق ان کی کہانیوں کے چند مجموعے بھی اشاعت یافتہ ہیں۔ مزید برآں ان کی ایک اور کتاب ''قانون ساز کاؤنسل میں اولیت'' بھی شائع شدہ ہے جس کا تعلق صحافت سے ہے۔ قاسم خورشید کی دو کتابیں ''ٹوٹے ہوئے چہرے'' اور ''سنولائی دھوپ'' بھی پکی روشنائی میں ملتی ہیں جو اصل میں مرتبہ کتابیں ہیں اور شاعری سے رشتہ مند ہیں۔ قاسم خورشید کے ٹیلی ڈرامے ''درد گزرا ہے دبے پاؤں'' بھی موجود ہے۔ فلم اور ٹیلی ویژن کی دنیا سے بھی قاسم خورشید کا رشتہ معلوم و معروف ہے۔ قاسم خورشید نے نہ صرف بہت سارے ریڈیائی اور فلمی فیچرز لکھے، تحقیقی و تبصراتی مضامین قلم بند کئے اور ان کی کہانی ''ڈر سے آگے'' کو صدر جمہوریہ ہند سے اجرا شدہ انعام یافتہ کہانی کا درجہ ملا، بلکہ اردو کے ساتھ ساتھ وہ ہندی ادب کو بھی اپنے فکشن اور اپنی شاعری سے متمول بناتے رہے۔ ''تھکن بولتی ہے'' اور ''دل تو ہے بنجارہ''، ہندی میں ان کے شعری مجموعے ہیں تو ''کشن پورہ کی مسجد''، ''کوئی ہاتھ''، ''تھار پر زندگی'' اور ''گنجا کی نینی'' ان کی کہانیوں کے مجموعے۔ ان کا قلمی سفر پورے آب و تاب اور تازہ بہ تازہ منصوبوں پر عمل درآمد کے ساتھ جاری تھا، مگر افسوس کہ ان کا وقت موعود آگیا اور ان کے فن سے اور ہندی فلم ادب کی گوناگوں توقعات ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئیں۔

☆☆☆

☆ ''زبان وادب'' کا حالیہ ملا۔ یہ شمارہ مشترکہ (اگست تا اکتوبر ۲۰۲۵ء) ضرور ہے، مگر اس کی روایتی آب وتاب میں سرمو فرق نہیں، پھر یہ کہ آپ نے تکنیکی مجبوریوں کا اظہار ہی نہیں کیا ہے بلکہ معذرت خواہی کے ساتھ مجھ جیسے پڑھنے والے کی دلجوئی کے لئے ہی سہی، کچھ ضخامت بھی بڑھا دی ہے، جسے میں آپ کی صحافتی دیانت اور آپ کا اخلاقی بڑاپن کہہ دوں تو شاید آپ برا نہ مانیں گے۔ دیدہ زیب اور رنگین سرورق سے آراستہ یہ شمارہ یقیناً موضوعی اور صنفی لحاظ سے بھی خاصا وقیع ہے اور تصاویر وعکوس کے لحاظ سے بھی۔ پہلے اندرونی سرورق پر عزیزؔ عظیم آبادی کی تصویر دیکھی جو کسی نایاب تصویر کے مصداق ہے، اس لئے کہ اُن کا مجموعہ ''سیل آتش'' جو لگ بھگ پچاس سال پہلے بہار اردو اکادمی سے چھپا تھا، اس میں بھی حضرت عزیزؔ کی تصویر نہیں ہے۔ اسی طرح مجھے ذکر کرنے دیجئے ص ۱۲۰ پر ڈالے گئے ایک اشتہاری تراشے کے عکس کا۔ یہ عکس بچوں کے حصہ کی تحریر ''فضول خرچی'' کو تو جان دار بنا ہی رہا ہے۔ مزید لطف یہ بھی ہے کہ تقریباً ۶۵ سال پہلے اشاعت یافتہ بچت فاؤنڈیشن کے اس اشتہار نے ماخذ کے حوالے سے گویا دستاویزی نوعیت پالیا ہے۔ محنتوں اور محبتوں سے کاموں میں رمق آتی ہے اور یہ سب کچھ آپ کے اسی صحافتی مزاج کا ثمرہ ہے۔ ''حرف آغاز'' پڑھا، مشمولات کے تعارفی سمندر کو آپ نے

واقعی کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری ہمارے پرانے لکھنے والوں میں ہیں اور ''شہرنامہ بہار'' میں انہوں نے سچ مچ بڑی چابک دستی سے موضوع کے سبھی اہم پہلو ہمارے لئے آئینہ کر دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نوجوانوں اور خصوصاً طلبا وطالبات کو اس سے کافی معلومات ملے گی۔ یہ مضمون کیا، اپنے موضوع پر ایک جامع کتابچہ ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر محمد ارمان کا مقالہ ''پروفیسر اشرف جہاں کے عنوانیہ افسانے'' پڑھا اور اس کی تجزیاتی شان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، یہاں کچھ خطابیہ انداز ضرور آ گیا ہے، مگر وہ نہ تو لطف سے خالی ہے اور نہ ہی تحریر کو پراثر بنانے کا مقصد پانے میں ناکام ہے۔ براہ راست مطالعہ کے بعد اتنی محنت سے اس قدر گہرے اور بھرپور تجزیہ کے لئے انہیں مبارکباد! اب تو سہل انگاری سے مزاج بدل چکا ہے، مگر علمی تنقید کی اہمیت، افادیت اور طلبا کے لئے اس کی ضرورت بہرحال طے شدہ ہے۔ ''شادؔ کی سوانح نگاری'' پر ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی اور حاذقؔ انصاری کی شاعری پر جناب عبدالرزاق رضوی کا مقالہ بھی نہایت ہی مبسوط اور عمدہ مقالہ ہے جو اپنے اپنے موضوع سے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں انصاف کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد ثاقب انور ''ابراہیم جلیس اور ان کے بھائی'' کا تذکرہ لے کر اس شمارے میں آئے ہیں۔ بھائی بھائی کی الگ الگ قسمت! دراصل مجتبیٰ حسین کے کارناموں کی دھوم نے اُن کے بھائیوں کی طرف سے ہمارا دھیان ہٹا دیا، اس کی کئی اور وجہ بھی ہے، بہرحال اس مقالے نے معلومات میں اضافہ بھی کیا اور تازگی بھی لا دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ موضوع کے ساتھ قلم کار کا وطیرۂ پیش کش بہت معنی رکھتا ہے اور یہ پہلو یہاں بہرحال اُجاگر ہے۔ سعادت حسن منٹو پر، ان کے افسانوں کی روشنی میں تو باتیں ہوتی رہتی ہیں، البتہ نزہت پروین نزہتؔ صاحبہ نے اُن کے اقوال سے سہارا لے کر جو مضمون لکھا ہے، وہ اس رُخ سے خصوصیت کے ساتھ اپنے انفراد کا احساس دلا گیا، اس میں اقتباسات طویل تو ہیں، مگر پڑھتے وقت گراں نہیں گزرتے۔ زیر نظر شمارے میں جمیلہ ہاشمی کے ناولٹ ''چہرہ بہ چہرہ روبرو'' کا جناب محمد اعظم کے قلم سے تجزیاتی مطالعہ بھی تشنہ نہیں اور جناب محمد معروف عالم نے بھی ''اردو کی

تعمیر وترقی میں متھلا کا کردار'' نہایت اچھے ڈھنگ سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شمارے میں ''شخصیات'' پر چار مضامین نے جگہ پایا ہے اور سبھی اپنی اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ خصوصاً جناب مشتاق احمد نوری کی تحریر ''سرسید احمد خاں کٹہرے میں؟'' اپنے عنوان سے سوالیہ نشان کو ہٹانے میں یعنی سرسید پر ہونے والے اعتراضات کی حقیقت بتانے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اصل معاملہ یہی ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کو اس کے عہد و ماحول سے الگ کر کے دیکھنے پر اس کا نقشہ بگڑ ہی جاتا ہے۔ سرسید کے معترضین سے بھی یہی غلطی ہوئی، جس کی اس مضمون میں اصلاح اور وضاحت ہوگئی ہے۔ ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا فن کار ہوتا ہے۔ یہ محض ایک کہنے کی بات نہیں، بلکہ فراق پر حکیم رشاد الاسلام کا مضمون پڑھ کر بار بار یہ بات ذہن میں اپنا توثیقی مقام بھی بناتی رہی۔ براہ راست جستجو اور معلومات سے اس تحریر کی بنت ہوئی ہے جو یقیناً مجھ جیسے پڑھنے والے کے لئے بے اثر نہیں رہی۔ ڈاکٹر محمد محمود عالم نے آل احمد سرور کی شخصیت کا امتیازی رُخ جس طرح دکھایا ہے اور اس کے تشکیلی عناصر کی طرف جس طرح اشارے کئے ہیں، وہ بھی پسندیدگی کے حقدار ہیں اور جناب محمد شوکت جمال کے مترجمہ مضمون پر اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ ''اودادیوی'' سامنے آئیں تو سر عقیدت سے جھک گیا۔ بیشک وہ شہید ناز کہلائیں گی اور ان کی جانبازی و بہادری کا تاریخی حوالہ، جنگ آزادی کا روشن باب بن کر چمکتا رہے گا۔ یہ خط طویل ہوتا جارہا ہے اور ''افسانے'' کے تعلق سے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ ''ایثار محبت'' (فخرالدین عارفی) ''پٹاری کا سانپ'' (محمد طارق) اور ''غم کے سائے میں خوشی'' (امتیاز غدر) پر آپ نے ''حرف آغاز'' میں جو باتیں لکھی ہیں، اُن سے مجھے پوری طرف اتفاق ہے۔ بیشک یہ سب قاری کو متاثر کردینے والی اور کافی دیر تک اپنی گرفت میں رکھنے والی کہانیاں ہیں۔ ''گاہے گاہے باز خواں'' میں ''اسلوب'' (ریاض احمد) ہو یا اُس کے ساتھ دیا ہوا فیلر (ص ۸۳) یا ''انکار یہ جملہ میں امدادی فعل'' (ڈاکٹر سلام سندیلوی) یہ سب بہت ہی قیمتی تحریریں ہیں اور ایسے ادبی تبرکات کے مصداق، جن کے فیوض دائمی ہوتے ہیں اور جنہیں غور سے پڑھنے پر ذہن کی نہ جانے کتنی ہی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ رہی بات نظریاتی و علمی اختلافات کی تو اس کے حقوق محفوظ ہیں، مگر وہ ہمیں اس کے وزن و وقار کا بہرحال منکر نہیں بنا سکتے۔ منظوماتی اوراق اگر شاعروں کی فکری وفنی صلاحیتوں کے مظہر ہیں، تو اس میں بھی دورائے نہیں کہ ''کتابوں کی دنیا'' کے قلم کاروں نے بھی صرف تبصرے کی رسم ادا نہیں کی ہے۔ شکیل سہسرامی کی وفات پر تعزیتی شذرہ پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں اور پھر ایسا بھی لگا، جیسے ان پر اس تعزیتی شذرہ کی شکل میں منی مونوگراف پڑھنے کو مل گیا ہو۔

(ڈاکٹر) نشاط اختر، ویشالی

☆ ماہنامہ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ملا۔ یہ اگست تا اکتوبر ۲۰۲۵ء کا شمارہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ صفحات دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی جو ہم بچوں کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' سچ مچ بہت پیارا ہے اس شمارے میں معاذ اقبال کی حمد چھپی ہے، اس میں ایک دو جگہ کمپوزنگ کی غلطی (جیسے لاکھ کی جگہ ''راکھ'' اور سوا کی جگہ ''سا'') ضرور ملی، لیکن اس سے قطع نظر یہ پڑھ کر یہی احساس ہوا کہ اللہ سے ہمیں کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، مایوسی کفر ہے۔ اللہ ہی اپنے بندوں کا سب سے مضبوط سہارا ہے اس کے در سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا، وہ سب کو دیتا ہے۔ حمد کا یہ مصرع تو بہت ہی عمدہ ہے کہ اُس کی ''رحمت کے سمندر کا کنارہ نہیں دیکھا'' اس حمد کی ردیف کا آخری لفظ ہے ''دیکھا'' اور اس میں کیا شک کہ اللہ کی بے پناہ رحمت کے نظارے ہر جگہ اور ہر وقت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی صفحہ پر آپ نے حیدر بیابانی کی نظم ''بچپن'' بھی چھاپی ہے۔ کتنی پیاری ہے یہ نظم! بتانے کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ بڑے بھی اسے پڑھیں گے تو انہیں اپنا بچپن یاد آنے لگے گا۔ بچپن ایک نعمت ہے اور یہ نظم کیا ہے، گویا ہم جیسی عمر کے بچوں کی آج کی زندگی کی پوری تصویر ہے۔

ماں باپ بھائی بہن کی محبت کا بدل کہاں! اس شمارے میں دو نظم اور ہے اور لگے ہاتھوں اس کا بھی ذکر ہو جائے تو کیا حرج! یاور راشد یاورؔ کی نظم ''آزاد تھے، آزاد ہیں، آزاد رہیں گے'' کورس میں گائی جانے والی ایک بہترین نظم ہے تو اسرائیل علی سفیرؔ مانچوی کی نظم ''اردو زبان'' بھی اپنے موضوع پر بہت خوب ہے بیشک ۔

اس کو حاسد گرانہ پائیں گے ایسا پختہ مکان ہے اردو

اس شمارے میں ایک طرف مجیر احمد آزاد کی کہانی ''.....شان ترنگا ہے'' اور دوسری طرف قاضی تضمین کی کہانی ''آزادی کا سبق'' ہے اور اس میں دو رائے نہیں کہ یہ دونوں کہانیاں بہت دلچسپ اور بہت کامیاب ہیں، ان میں جہاں قومی پرچم کو عزت دینے کا سبق ہے، وہیں آزادی کے لئے قربانی دینے والوں کی یاد بھی ہے اور گاندھی جی کی قیمتی نصیحت بھی، کہانی کیا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم اسکول میں اسمبلی کا لطف لے رہے ہیں یا فلم کے پردے پر کہانی دیکھ رہے ہیں۔ اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر دونوں کہانی کاروں کو مبارکباد! شرف الہدیٰ کا مضمون ''کارٹوگرافی کیا ہے؟'' خاصا معلوماتی مضمون ہے اور پرویز اختر کی کہانی ''فضول خرچی'' بھی زندگی سنوارنے والی اور نقصان دہ عادت سدھارنے والی سیکھ دے رہی ہے۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے یاد آیا کہ وضو کرتے وقت زیادہ پانی بہانے یعنی پانی کی فضول خرچی سے بھی گھر اور اسکول، مدرسہ میں برابر منع کیا جاتا ہے اور تھوڑا سا پانی پی کر، گلاس کا زیادہ پانی پھینک دینے پر بھی ڈانٹ پڑتی ہے۔ زیادہ بولنے سے بھی روکا جاتا ہے اور دو لفظ کی بات دس لفظ میں لکھنے پر بھی ٹیچرز ٹوکتے ہیں کہ الفاظ کی فضول خرچی مت کرو۔ لفظ ہو، پیسہ ہو یا پانی، ہر چیز کی قدر کرنے اور اسے فضول بربادی سے بچانے میں ہی فائدے ہیں۔ بچت بڑی چیز ہے اور اس مضمون کے ساتھ ایک اشتہار کا جو تصویری فیلر آپ نے دیا ہے، وہ تو گویا مضمون کی روح اور اس کے پیغام کو سمجھنے کے لئے سونے پر سہاگہ جیسا ہے۔

کائنات ضیا، نالندہ

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۵ء باصرہ نواز ہوا، مشمولہ تخلیقات پسند آئیں جو آپ کی محنت شاقہ کی غماز ہیں۔ ص ۳۴ پر میرے اولین قطعہ کے اول مصرع میں ایک سبب (لفظ ''بھی'') کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے۔ مصرع یوں پڑھا جائے ع

جس کو نہ سوچا کسی نے ''بھی'' کبھی

منیرؔ سیفی، سمن پورہ، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' (جولائی ۲۰۲۵ء) موصول ہوا۔ شکریہ! اس میں ''حرف آغاز'' کی تحریر شاندار ہے۔ مضامین ''ابن صفی اور ان کے جاسوسی ناول'' کے لئے محترمہ درخشاں جبیں اور ''نوحؔ ناروی اور ان کی شاعری'' کے لئے جناب نجم الزماں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ عشرت ظہیر اور ڈاکٹر نہال افروز کے افسانے دل کو چھوتے ہیں۔ ایس معشوق کا انشائیہ بھی پسند آیا۔ وہاب اشرفی کے خطوط میں یادرفتہ سے لئے گئے کئی ادبی پھول مہکتے ہیں اور علیم اللہ حالیؔ کی جدید نظم قاری کو کئی گوشوش کی طرف لے جاتی ہے۔ علی شاہد دلکشؔ کی نظم اچھی ہے۔ منیر سیفی کے قطعات میں کئی خوبیاں ہیں۔ شعری تخلیقات بھی قابل تعریف ہیں۔

(ڈاکٹر) شاہد فروغیؔ، ہوڑہ

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۵ء ملا۔ اس شمارے میں جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ابن صفی کو جس اہتمام اور توجہ سے بھرپور انداز میں پڑھنے والوں کے سامنے لایا گیا ہے، وہ محض معلوماتی اور ادبی نہیں تاریخی اور دستاویزی بھی ہے۔ محترمہ درخشاں جبیں اور محترم منیرؔ سیفی اس حوالے سے واقعی مبارکباد کے لائق ہیں۔ اسی طرح ''نوحؔ ناروی اور ان کی شاعری'' پر جناب نجم الزماں کا مقالہ بھی جامع اور مدلل ہے۔ افسانے، انشائیہ اور منظومات کے حصے بھی لائق مطالعہ ہیں۔

شاہد احمد، دھنباد

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا
زبان وادب

☆	ہندوستانی بچے	انور آفاقی	۹۸
☆	چھینک: ہمارے جسم کا مکالمہ	عظیم اقبال	۹۹
☆	سی وی رمن: ایک عظیم سائنس داں	محمد انس	۱۰۰
☆	سیب کھائیں، بیماریاں بھگائیں	امتیاز احمد انصاری	۱۰۱
☆	سائنس کا ترانہ	منوّر داناپوری	۱۰۳
☆	چیونٹی	محمد علی رضا	۱۰۴

انور آفاقی
"Hoda Manzil" Rajtoli, P.o. Lalbagh, Dist. Darbhanga - 846004 (Mob.9931016273)

ہندوستانی بچے

ہندوستانی بچے ہیں ہم جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں ہم
پیار محبت کرتے ہیں سب سے دل میں سبھی کے بستے ہیں ہم
ہندوستانی بچے ہیں ہم

رات ہو کالی یا دن ہو سنہرا رکتا نہیں گنگا کا دھارا
اپنا ہے یہ دیش کہ جس میں ہر جا ہے قدرت کا نظارا
ہندوستانی بچے ہیں ہم

تاج محل ہے شان ہماری لال قلعہ ہے جان ہماری
ان کی حفاظت فرض ہے ہم پر ان سے ہے پہچان ہماری
ہندوستانی بچے ہیں ہم

ملک سے اپنے پیار ہیں کرتے دشمن سے ہم تو نہیں ڈرتے
ہندستاں کا نام ہو روشن اس کے لئے ہم کوشاں رہتے
ہندوستانی بچے ہیں ہم

صبح کریں گے شام کریں گے سارے اچھے کام کریں گے
کر کے قرباں جانیں اپنی جگ میں دیش کا نام کریں گے
ہندوستانی بچے ہیں ہم

صبح و سویرے جاگ کے پہلے رب کا اپنے نام ہیں لیتے
پھر ہم اپنے دیش کی خاطر جی بھر کے ہیں دعائیں کرتے
ہندوستانی بچے ہیں ہم

روزانہ اسکول ہیں جاتے کاپی کتابیں پیٹھ پہ لادے
پڑھ لکھ کر انسان بنیں گے ہم محنت سے نہیں ہیں ڈرتے
ہندوستانی بچے ہیں ہم

عظیم اقبال
Adbistan, Ganj - 1, Bettiah - 845439 (Mob. 9006502649)

چھینک: ہمارے جسم کا مکالمہ

بچو! اکثر یہ مقولہ سنا جاتا ہے کہ ''کچھ بھی بے وجہ نہیں ہوتا!'' اور سائنس کے حوالے سے بھی یہ جملہ عام ہے کہ ''ہر عمل کا سبب ہوتا ہے'' اور چھینک کا بھی بہر حال سبب موجود ہے۔

چھینک ہمارے جسم کا مکالمہ ہے، جو انکار کے مترادف ہے۔ یہ ان ننھے ذرات (Particles) سے خطاب ہے، جو ناک کے راستے، اس کے اندرون داخلے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ یہ ذرّات ناک کی نلیوں میں جب ارتعاش پیدا کرتے ہیں تو ناک میں ہلکی گدگدی ہوتی ہے۔ اس کے سبب ہم چھینکتے ہیں۔ انگریزی میں چھینک کو Sneeze کہتے ہیں۔ عام طور سے چھینکتے وقت ہم لمبی سانس کھینچتے ہیں، پھر ہوا کو تیزی سے ناک اور منھ کے باہر نکالتے ہیں تاکہ وہ ذرّات جو سانس کی نلی پر حملہ آور ہوئے ہیں، باہر نکل جائیں۔

پہلے چھینک کو کسی بدشگون کا اشارہ سمجھا جاتا تھا ایسے موقع پر آپ کا قریبی شخص خیر کی دعا مانگتا تھا۔ جرمنی میں "Sesun Deit" کہنے کا چلن تھا۔ دوسری جگہوں پر "Bless you" کہتے تھے۔ ہمیں چھینک آنے پر ''الحمدللہ'' کہنے کا اور سننے والے یرحمك الله۔

چھینک آنے پر ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ایسا غیر شعوری عمل کے تحت ہوتا ہے۔ وہ پٹھے (Muscles) جو چھینکتے وقت شریک عمل ہوتے ہیں، وہ ہیں، سینے کے پٹھے، پھیپھڑوں کے زیریں حصے کے بڑے پٹھے (Dia Phrasm) اور آواز کی نلی (Vocal Cord) پر اختیار (Control) رکھنے والے پٹھے، نیز حلق کے عقبی پٹھے (Back Muscles) جنہیں کسی چیز سے زود حسی (Sensitivity) یا الرجی (Allergy) ہو، جیسے زرگل (Pollen) جانوروں کے بال، کوئی غذا یا مشروب، انہیں متواتر چھینکیں آئیں تو حیرت زدہ نہ ہوں۔ موسم کی تبدیلی کے وقت، ذرا سی بداحتیاطی سردی کو دعوت دیتی ہے، آپ زکام کی زد میں ہوتے ہیں۔ اس کی ابتدا بھی اکثر چھینکوں سے ہوتی ہے۔

آپ کی چھینکیں دوسروں کو بھی ناگوار لگیں گی۔ آپ کے لیے یہ زحمت ہیں اور دوسروں کے لیے یہ تکلیف دہ ہیں۔ کسی ایسے موقعے پر خود سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھیں۔ اتنا ضرور کریں کہ اُس گھڑی ناک اور منھ ڈھک لیں۔ رومال دستیاب ہو تو اس کی مدد لیں، بصورت دیگر صرف ہتھیلی کا استعمال کریں۔ اس سے چھینک کی آواز دھیمی پڑ جائے گی اور کسی کو گراں نہ گزرے گی۔ مزید، فضائی آلودگی بھی کم ہوگی، یہ بھی خیال رکھیں کہ چھینک کا ہدف سامنے والا شخص ہرگز نہ بنے۔ ❁❁

دلچسپی سے ہم پڑھتے ہیں — کھیل کود بھی ہم کرتے ہیں
خوف کسی سے ہم نہیں کھاتے — بس اللہ سے ہم ڈرتے ہیں
ہندوستانی بچے ہیں ہم

اچھا ہے اسکول ہمارا — ہم سب کے فیوچر کا سہارا
سب ٹیچر اچھے ہیں ہمارے — علم کی دولت کے ہیں داتا
ہندوستانی بچے ہیں ہم

❁❁❁

محمد انس
30 "Gulistan Colony" Near Pande Lawns, Nagpur- 440013 (Mob. 9270019818)

سی وی رمن: ایک عظیم سائنس داں

فروری کی ۲۸ تاریخ کو بھارت میں ''یوم سائنس'' منایا جاتا ہے۔ بھارت میں سائنس کی ترقی میں یہ ایک یادگار دن ہے کہ اس دن ہمارے ملک کے عظیم سائنس داں سی وی رمن نے ایک زبردست سائنسی کھوج کو انجام دیا تھا جسے دنیا ''رمن ایفکٹ'' (Raman Effect) کے نام سے جانتی ہے۔ انہوں نے سائنس کے میدان میں اس کے علاوہ بھی کئی قابل ذکر کارنامے انجام دئے۔

سی وی رمن کا پورا نام چندر شیکھر وینکٹ رمن تھا۔ وہ ۷/نومبر ۱۹۸۸ء میں ایک برہمن خاندان میں ترچناپلی میں پیدا ہوئے۔ اب اس شہر کا نام تروچراپلی ہے جو دکن کی ریاست تامل ناڈو میں ہے۔ سی وی رمن کے والد چندر شیکھر ایئر ایک کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ سی وی رمن نے اسکول کا امتحان ۱۸۹۹ء میں پاس کیا اور پھر وہ وشاکھا پٹنم کے ای وی این کالج میں دو برسوں تک زیر تعلیم رہے۔ انھوں نے مدراس کے پریسیڈینسی کالج سے بی اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے انڈین سول سروس کا امتحان دیا، مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ انھوں نے فزکس میں ۱۹۰۷ء میں ایم اے کیا۔

تعلیم کے زمانے سے ہی سی وی رمن کو غور وفکر کی عادت تھی ان کا تنقیدی انداز اور چیزوں کے متعلق تجسس ان کی غیر معمولی شخصیت پر گواہی دینے لگا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ کلکتہ میں اسسٹنٹ اکاونٹینٹ جنرل

کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ایک دن جب وہ دورانِ ملازمت کام پر جارہے تھے تو ان کی نظر ایک عمارت پر لگے بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا:

''انڈین ایسوسی ایشن فار دی کلٹیویشن آف سائنس'' (I.A.C.S) انھوں نے جلد ہی اس ادارے سے رابطہ قائم کیا۔ یہ ادارہ سائنس کی ترقی کے لیے ڈاکٹر مہندلعل سرکار کے ذریعے ۱۸۷۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ سی وی رمن کو ابتدا ہی سے سائنس سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے آواز کی لہروں سے متعلق کئی تجربات کے ذریعے تحقیق کی اور سائنسی آلات سے ریکارڈنگ کے ذریعے ان کی جانچ کے طریقے بھی دریافت کئے۔

سی وی رمن کو ۱۹۳۰ء میں روشنی کے بکھراؤ (Scattering of Light) کے متعلق دریافت پر علمِ طبیعیات کا سب سے مشہور انعام نوبل پرائز دیا گیا۔ ان کی یہ دریافت "Raman Effect" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سائنس کا ایک رجحان ہے جو روشنی کے مادے کے ساتھ متعلق ہے۔ اس کے مطابق، جب روشنی کسی مادے (مثلاً گیس، مائع یا ٹھوس) سے سے گزرتی ہے تو روشنی کا ایک چھوٹا سا حصہ اپنی توانائی کے ساتھ منتشر ہوتا ہے۔ اس عمل میں روشنی کے فوٹونز مادے کے مالیکیولز کے ساتھ تعامل کرتے ہیں جس سے روشنی کی فریکوینسی (طولِ موج) میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ تبدیلی مادے کے مالیکیولز ڈھانچے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اسے ''رمن اسکیٹرنگ'' کہتے ہیں۔

سی وی رمن کی دریافت "Raman Effect" فزکس اور کیمسٹری میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اور اس علمی دریافت کو اہم پیش رفت سمجھا جاتا ہے۔ اس تحقیق نے ان شعبوں میں مزید تحقیق کے دروازے کھول دئے۔

سی وی رمن خواتین کی تعلیم کے بڑے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سائنس کی تعلیم سے متعلق عورتوں میں دلچسپی پیدا ہو تو وہ

امتیاز احمد انصاری
H.No. 24, Railpar, Jahangiri Mohalla, Asansol - 713302 (Mob. 9749289061)

سیب کھائیں، بیماریاں بھگائیں

سائنسی طور پر Malus domestica کے نام سے جانا جانے والا سیب سنسکرت لفظ ''سیو'' سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک خوشنما، خوشبودار، لذیذ اور معجزاتی خصوصیات رکھنے والا پھل ہے۔ تقریباً تمام دنیا میں کاشت کیا جانے والا یہ پھل اتفاق سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ کھایا جانے والا پھل بھی ہے۔ پوری دنیا میں اس کے سات ہزار سے زائد اقسام پائے جاتے ہیں۔ سیب کی پیداوار میں ملک چین کو اولیت حاصل ہے، مگر ذائقے کے اعتبار سے جنت ارضی کشمیر کا سیب منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہاں سالانہ سات سے آٹھ ہزار ٹن سیب پیدا کئے جاتے ہیں۔

انگریزی کا مشہور مقولہ ہے:

"An apple a day keeps the doctor away"

یعنی روزانہ ایک سیب کھانے کی عادت ڈاکٹر کو دور رکھتی ہے۔ سیب کی غذائی اہمیت اور جادوئی صفت کے پیش نظر طبی سائنس اس مقولے کو بہت حد تک درست مانتی ہے۔

سیب یقیناً اچھی صحت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کا روزانہ استعمال نہ صرف جسمانی قوت مدافعت بڑھاتا ہے بلکہ بہت ساری بیماریوں سے بھی بچاتا ہے۔ دوسرے پھلوں کے مقابلے سیب میں فاسفورس اور فولاد کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ روزانہ سیب کھانے سے خون کا صاف ہونا، جلد کی رنگت کا نکھرنا اور چہرے پر سرخی کا آنا تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ڈاکٹر اور ماہرین غذائیات ہی نہیں بلکہ بزرگوں نے بھی سیب کے استعمال کو فائدہ مند بتایا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی ابن طالب کا قول ہے۔

''سیب کھاؤ، کیونکہ یہ معدے کو صاف کرتا ہے۔''

امام جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ:

''سیب کھاؤ، یہ دماغ سے خون (نکسیر) آنا روکتا ہے۔''

درحقیقت سیب غذائی اجزاء سے بھرپور پھل ہے۔ ماہرین غذائیات نے سیب کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ 100 گرام کے ایک سیب میں 85.55 گرام پانی، 13.81 گرام کاربوہائیڈریٹ، 10.39 گرام شکر، 2.4 گرام فائبر اور 0.26 گرام پروٹین کے علاوہ وٹامن B1، B2، B6، C، E اور K سمیت فولک ایسڈ، کیلشیم، میگنیشم، پوٹاشیم، لوہا، فاسفورس اور جستہ پایا جاتا ہے۔

سیب میں فائبر اور پانی کی مقدار کافی زیادہ ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے استعمال کے بعد پیٹ بھرے رہنے کا احساس زیادہ

اس میدان میں بہت آگے بڑھ کر ترقی کر سکتی ہیں کیونکہ ان میں مردوں کے مقابلے میں کام کی لگن بہت زیادہ ہوتی ہے۔

سی وی رمن جمہوریت کے بھی زبردست حامی تھے۔ ان کے قول کے مطابق ہمارے ملک میں جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ فرد کی آزادی کو ختم کر دیا جائے۔ بغیر آزادی کے جمہوریت بے کار ہے۔ سی وی رمن کہا کرتے تھے:

"Ask the right questions.and nature will open the doors to the secrets."

(یعنی آپ صحیح سوال پوچھئے، قدرت اپنے رازوں کے دروازے آپ پر کھول دے گی۔)

سی وی رمن ۱۹۳۳ء میں بنگلور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے پہلے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ ان ہی کے ذریعے انڈین اکاڈمی آف سائنس بھی قائم کی گئی۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا جہاں وہ اپنی عمر کے آخری برس تک خدمات انجام دیتے رہے۔

۲۱ نومبر ۱۹۷۰ کو اس عظیم سائنس داں کا انتقال ہو گیا۔ ❁❁

دیر تک رہتا ہے۔ ایک تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ سیب کھانے سے بھوک کا احساس زیادہ دیر سے ہوتا ہے نتیجے کے طور پر کھانے کی خواہش کم ہوتی ہے۔ اس طرح سیب کے استعمال سے جسمانی وزن میں کمی آتی ہے۔ یعنی سیب موٹاپا دور کرنے اور اس پر قابو رکھنے میں بھی مددگار ہے۔ سیب میں موجود فائبر معدے کی صحت کے لئے مفید ہونے کے ساتھ قبض دور کرنے میں بھی مدد کرتا ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کے سیب کھانے سے خون میں کولیسٹرول کی سطح قابو میں رہتی ہے۔ اس میں موجود متعدد فوائد کے حامل مرکبات میں پولی فینولز نامی اینٹی اکسیڈنٹس بلڈ پریشر کی سطح کو گھٹانے میں معاون ہوتے ہیں۔ ایک امریکن رپورٹ کے مطابق جو لوگ روزانہ دو سیب کھاتے ہیں، ان کے خون میں اچھا کولیسٹرول قدرے بلند ہوتا ہے جس سے خون کی نلیوں کی چوڑائی بڑھ جاتی ہے اور اس طرح دل کا دورہ پڑنے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

سیب میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس پھیپھڑوں، چھاتی اور غذائی نلی کے کینسر سے بچاتا ہے۔ ماہرین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ سیب اور ناشپاتی کا روزانہ استعمال ذیابیطس ٹائپ 2 سے متاثر ہونے کا کا خطرہ 28 فیصد تک کم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سیب دمہ جیسے مرض کی شدت میں بھی کمی لانے کا باعث ہے۔ واضح ہو کہ سیب کو چھلکوں سمیت کھانا زیادہ فائدہ مند مانا جاتا ہے کیونکہ سیب میں موجود فائبر کا 50 فیصد اور پولی فینولز کی بیشتر مقدار سیب کے چھلکوں میں موجود رہتی ہے۔

جیسا کہ ہم سبھوں کو علم ہے کہ کسی بھی چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوا کرتی ہے، چنانچہ زیادہ سیب کھانے سے خون میں گلوکوز بڑھنے، آنتوں پر بوجھ پڑنے اور دانتوں میں خرابی پیدا کرنے کے ساتھ ہضم کے نظام کو متاثر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح صحیح وقت پر سیب کا استعمال جہاں فائدہ پہنچاتا ہے وہیں غلط وقت پر اس کا استعمال نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ سیب گرچہ سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے کبھی بھی کھایا جا سکتا ہے، لیکن اسے صبح سویرے کھانا صحت کے اعتبار سے بہتر بتایا گیا ہے۔ صبح ناشتہ میں سیب کھانے سے اس کے فائدے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ سیب میں موجود فائبر کی بڑی مقدار رات کو ٹھیک سے ہضم نہیں ہونے دیتی ہے، اس لئے رات میں سیب کھانے سے ہاضمہ کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیند کی پریشانی کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ❁❁

چاند دن میں غائب کیوں؟

چاند دن میں کیوں غائب ہوتا ہے؟ وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتا، اس لئے ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے دکھائی نہ دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہماری زمین کے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ چاند ہماری زمین کے چاروں طرف چکر لگاتا ہے، چوں کہ زمین گول ہے اس لئے دنیا کے تمام حصوں میں ایک ہی وقت میں نظر نہیں آتا ہے۔ دن میں چاند کے دکھائی نہ دینے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ہے سورج کی روشنی، چونکہ سورج کی روشنی کے آگے چاند کی روشنی بالکل ماند پڑ جاتی ہے، اس لئے وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ کبھی کبھی صبح یا شام کے وقت جب سورج کی روشنی کم ہو جاتی ہے اور چاند زمین کے اس حصے میں ہوتا ہے جہاں ہم بستے ہیں تو وہ ہمیں دکھائی دینے لگتا ہے۔ چاند ہماری زمین سے بہت چھوٹا ہے وہ ہماری زمین سے کم از کم دو لاکھ اکیس ہزار میل اور زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ترپن ہزار میل کے فاصلے پر زمین کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔ زمین کے گرد اس کا چکر ساڑھے انتیس دن میں پورا ہوتا ہے یعنی ایک نئے چاند سے دوسرے چاند تک کا وقفہ انتیس دن بارہ گھنٹے اور چوالیس منٹ ہوتا ہے۔ چاند ہماری زمین سے چھوٹا بھی ہے اور دور بھی، لیکن اس کی کشش کا اثر ہماری زمین پر پڑتا ہے۔ سمندر میں مد و جزر یا جوار بھاٹا کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ (ماخوذ)

منوّر داناپوری
Mohalla Shah Toli, Danapur Cantt. Patna - (Mob. 8789946411)

سائنس کا ترانہ

یہ زمیں ہماری ہے ، آسماں ہمارا ہے
آگے چاند تاروں سے ، اک جہاں ہمارا ہے

ہم تمام راہوں میں ، شمع نو جلائیں گے　　اک کے بعد اک ہم بھی راہِ نو بنائیں گے
گامزن خلاؤں میں ، کارواں ہمارا ہے
آگے چاند تاروں سے ، اک جہاں ہمارا ہے

ہم جہاں بھی جائیں گے ،گلستاں بنائیں گے　　کہکشاں ، ثریا تک پھول ہم کھلائیں گے
سچ ہے ، چاند تاروں میں گلستاں ہمارا ہے
آگے چاند تاروں سے ، اک جہاں ہمارا ہے

ہم یوروپا منگل پر سب سے پہلے جائیں گے　　اور آگے تاروں پر پھر قدم بڑھائیں گے
کیا کسی ستارے پر آشیاں ہمارا ہے؟
آگے چاند تاروں سے ، اک جہاں ہمارا ہے

نغمہ چاند تاروں پر اب ہمارا گونجے گا　　کہکشاں ثریا کیا ، چرخ سارا گونجے گا
آسماں کا ہر ذرّہ ترجماں ہمارا ہے
آگے چاند تاروں سے ، اک جہاں ہمارا ہے

آگے بڑھتے رہنے کا سلسلہ منور ہے　　آج اک ایک منزل کا راستہ منوّر ہے
ہر قدم خلاؤں میں کامراں ہمارا ہے
آگے چاند تاروں سے ، اک جہاں ہمارا ہے

محمد علی رضا
Khara Kuwa, Gulzarbagh, Patna City, Patna - 800007

چیونٹی

میں ہوں چیونٹی گرچہ مخلوقِ صغیر
بھول کر سمجھو نہ تم مجھ کو حقیر

میری ہمت دیکھ ، استقلالی دیکھ
حوصلوں سے میں ہوں مالامال دیکھ

آیتیں اُتری ہیں میری شان میں
تذکرہ میرا بھی ہے قرآن میں

میری فطرت میں ہے شوقِ جستجو
جس کے دَم سے تازہ رہتا ہے لہو

زندگی کے راستے پرپیچ ہیں
دشت و صحرا میرے آگے ہیچ ہیں

مفلسی سے میں تو گھبراتی نہیں
رزق دے گا دینے والا ، ہے یقیں

رب نے بخشا ہے بصیرت کا چراغ
گرچہ میں چھوٹی ہوں ، اونچا ہے دماغ

کاہلی مجھ کو کبھی بھاتی نہیں
دن گزرتے ہیں کہیں ، راتیں کہیں

مجھ میں کینہ ہے ، نہ کوئی ہے فساد
مجھ سے لے انسان درسِ اتحاد

زندگی گرچہ ہے میری مختصر
مجھ میں ہے لیکن محبت کا ہنر

باہمی الفت سے رہنا شان ہے
میری ملت کی یہی پہچان ہے

مٹیوں کے بل میں ہے میرا مکاں
زندگی کی ساری چیزیں ہیں جہاں

صبر کی دولت سے دامن ہے بھرا
دُکھ میں بھی ہونٹوں پہ ہے شکر خدا

ڈاکٹر منصور احمد اعجازی

ڈاکٹر منصور احمد اعجازی کی تاریخ ولادت ۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء اور آبائی وطن ڈیہولی شکرہ، مظفر پور ہے۔ وہ مشہور و معروف اعجازی خاندان کے چشم و چراغ اور ممتاز مجاہد آزادی ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی کے صاحبزادے تھے۔ ریاضیات میں ایم ایس سی اور ڈاکٹریٹ کی سند لینے کے بعد وہ عملی زندگی میں آئے اور بہار پبلک سروس کمیشن کے مسابقاتی امتحان میں کامیابی پاکر ۸/اکتوبر ۱۹۸۱ء سے بحیثیت سرکل آفیسر انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف اعلیٰ انصرامی عہدوں پر رہتے ہوئے ۳۱ جنوری ۲۰۱۲ء کو جوائنٹ سکریٹری محکمہ اقلیتی فلاح حکومت بہار کے منصب سے سبکدوش ہوئے۔ ڈاکٹر منصور احمد اعجازی نہ صرف انصرامی امور میں مثالی مہارت رکھتے تھے بلکہ انہیں علمی و ادبی مطالعہ کا بھی زبردست شوق تھا اور وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی میں بھی بہترین تحریری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اردو میں اُن کی کہانیوں کے مجموعے ''وسیلہ''، ''اچھوت خون'' اور ''صلہ'' اشاعت یافتہ ہیں۔ علاوہ ازیں ''بچہ چور، آدم خور'' کے نام سے اُن کا جاسوسی ناول بھی ۲۰۱۴ء میں چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر اعجازی کو شاعری سے بھی خاصا شغف تھا جس کا ثبوت اُن کا شعری مجموعہ ''نوائے دل'' ہے، جو ۲۰۱۳ء میں طبع ہوا ہے۔ ہندی میں ڈاکٹر اعجازی کی کہانیوں کا مجموعہ ''بے وفا'' اور ایام ملازمت کی یادوں پر مشتمل اُن کی آپ بیتی ''کھٹی میٹھی یادیں'' بھی اشاعت یافتہ ہیں۔ موخرالذکر کتاب ۲۰۱۷ء میں چھپی تھی۔ ڈاکٹر منصور احمد اعجازی ایک اچھے ترجمہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے بچوں کے لئے مضامین اور کہانیاں بھی لکھی ہیں اور تاریخی و علمی و ادبی موضوعات پر اُن کے پرمغز مقالے اور متعدد وقیع کتابوں پر اُن کے تبصرے بھی شائع شدہ ہیں۔ ڈاکٹر منصور احمد اعجازی ۲۳ فروری ۲۰۱۱ء سے ۳۱ جنوری ۲۰۱۲ء تک بہار اردو اکادمی کے سکریٹری رہے اور اکادمی مجلّہ ''زبان و ادب'' کو اپنی بہترین ادارتی صلاحیتوں سے نوازتے رہے۔ ان کے اداریہ کا ایک اقتباس اسی شمارے میں ص ۹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر عجازی کی وفات اتوار ۲۵ دسمبر ۲۰۲۲ء کو ہوئی اور دوسرے دن پنکھا ٹولی قبرستان مظفر پور میں مدفون ہوئے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)
Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75
SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 46 **Nov., Dec. 2025** **No. 11,12**

ایڈیٹر، پبلشر **ابرار احمد خان**، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

₹ 15/-